

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”تو فکرنا کرو میں کوشش کروں گا کہ تمہاری شادی محمود سے ہو جائے۔ فکرنا کرو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

اس شام وہ بغور نفیسہ کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ نفیسہ خوش تھی۔

اسی رات جب ایلی نے شہزادے بات کی تو وہ بگلا گئی بولی۔ ”کیا ہر تھوڑا کے لئے میری ہی لٹر کیاں رہ گئی ہیں۔“ ایلی نے اتنی اسے حالات سے آگاہ نہ کیا تاکہ نفیسہ کی شکایت کا پہلو نہ نکلے۔

ایلی کو محمود اور نفیسہ کی شادی سے قطعی کوئی وچھپی تھی۔ وہ اس حلے میں صرف اس لئے کوشش کر رہا تھا کہ نفیسہ چاہتی تھی کہ وہ محمود کی ہو جائے۔ ایلی نے شہزادے کو سمجھایا بھجا یا اور رضامند کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رو میڈیا کا نفیسہ سے نکاح ہو گیا۔

محمود ایلی کے گھر میں دس روز نفیسہ کے ساتھ رہا پھر اس نے نفیسہ کو زدائے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا چونکہ نفیسہ کا مطالبہ تھا کہ اسے بورڈنگ میں داخل کر دیا جائے تاکہ وہ بورڈنگ میں محنت کر سکے اور دویں پاس کر لے۔

جب دویں کا امتحان ہو چکا تو محمود نفیسہ کو لینے کے لئے آگیا اس نے اسے لا ہور کالج داخل کرنے کے جملہ انتظام کر کر کھے تھے۔

جب ایلی نفیسہ کو بورڈنگ سے لینے گیا تو نفیسہ نے آنے سے انکار کر دیا۔ پھر سکول کی استانیاں اکٹھی ہو گئیں اور وہ ایلی کو بر ابھلا کہنے لگیں۔ ان کی باتوں سے متشرع ہوتا تھا کہ وہ سمجھتی تھیں کہ نفیسہ کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔

ایلی حیران تھا۔ اسے کچھ کچھ میں نہ آ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا ذہین شل ہو چکا تھا۔ ایلی نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ کیا حماقت ہے نفیسہ! تمہاری شادی ہو چکی ہے تم دس روز اکٹھے رہ چکے ہو اور اب — لیکن یہ

شادی تو تمہاری رضامندی میں گئی تھی۔ ”نفیسے نے چلتے چلتے زور سے مارا اور ہاتھ
چھڑا کر بورڈنگ کی طرف بھاگی۔

طلاق

جب وہ گھر پہنچا تو شہزادیوں کھڑی تھی۔ جیسے شیر نی کچار میں کھڑی ہو وہ غصے
سے کانپ رہی تھی۔ ”اگر اپنا بھلا چاہتے ہو،“ وہ بولی۔ ”تو بھی میری بیٹی کو طلاق
دلاو۔ ورنہ۔“

”تو کیا تم بھی۔“ وہ شہزادی کی طرف حیرانی سے دیکھنا کا۔
”تم نے میری بیٹی کو ایک بدمعاش کے ہاتھ بیچا ہے۔“ شہزادی بولی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں کہہ رہی ہوں۔“ شہزادی بولی۔

”تم نے اپنی بیٹی سے پوچھا ہے کیا۔“

”میں سب جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔

شہزاد کے عقب میں صبیحہ اور ریحانہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

فرش پر عالی بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ ”ابو، ابو۔“

شہزاد گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ بورڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔

”غصہ میں نہ آو۔“ محمود ایلی کے پاس آ کھڑا ہوا۔

”تم جاؤ محمود۔“ وہ بولا۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہونے
والا ہے تم چلے جاؤ۔“

”کیوں۔“ وہ بولا۔

”بات بڑھ جائے گی۔“ ایلی نے کہا۔ ”بہت بڑھ جائے گی اگر تم یہیں رہے تو۔“

”ہوں یہ تو ٹھیک ہے۔“ محمود نے لپک کر اپنا سوت کیس اٹھالیا۔

”میں تمہیں اطلاع دوں گا۔“ ایلی نے کہا۔ محمود چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

ایلی صحن میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ وہ شہزاد کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تاہم کہ آخر وہ سب یک لخت کیوں بدلتے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی۔ وہ محسوں کر رہا تھا۔ جیسے وہ سب کچھ جو ہورہا تھا۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کا مقصد کیا تھا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ رات کے بارہ نجٹے تھے۔

باہر محلہ سفسان پر آتھا۔

دور کتے جھونک رہے تھے۔
کمرے میں لڑکیاں کاناپھوئی کر رہی تھیں۔
پلنگری پر عالی بیٹھا بیٹھا سوگیا تھا۔ اس کامنے ایلی کی طرف تھا۔
دفعتا شہزاد داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ فیصلہ تھی اور سکول کی ایک ادیڑ عمر کی استانی۔

ایلی انہیں چپ چاپ دیکھا رہا۔

شہزاد خاموش تھی۔ فیصلہ آتے ہی لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے اندر سے کندھی لگائی۔

استانی بولی۔ ”بہتر بھی ہے کہ آپ لڑکی کا فیصلہ کروں۔“ اس کا روئے خن ایلی کی طرف تھا۔

”آپ سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی شادی زبردستی کی گئی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”لڑکی بھی کہتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اور وہ ٹھیک کہتی ہے۔“ شہزاد بولی۔ ”لڑکی کو دھوکے سے چھانس لیا گیا ہے۔“

”لڑکی کو میرے سامنے باکر پوچھ لیجیے۔“ ایلی نے استانی سے کہا۔

”وہ سامنے نہیں آئے گی۔“ شہزاد دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر ایلی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بس نہیں آئے گی۔“ وہ غرائی۔

”کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔“ ایلی نے استانی سے کہا۔ ”میں نے یہ رشتہ لڑکی کی مشا کے مطابق کیا ہے۔ بلکہ اس کے اشارے پر کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔“

”بلکل غلط ہے۔“ شہزادی۔ ”بلکل غلط ہے۔ یہ شادی ایک سازش تھی۔ بہتر یہی ہو گا کہ فوراً سے طلاق دلائی جائے۔“

”ورنہ۔“ ایلی بولا۔

”ورنہ میں طوفان کھڑا کر دوں گی۔“ شہزادی۔

”ہوں۔“ ایلی بولا۔ ”طلاق مل جائے گی لیکن لیکن ہمارا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں رہے گا۔ تمہیں منظور ہے۔“

اس نے پوچھا۔

”منظور ہے۔“ شہزادی نے جواب دیا۔

ایلی اندر رچلا گیا۔ اس نے سوت کیس میں اپنے کپڑے بند کئے اور پھر سوت کیس اٹھا کر باہر نکل آیا۔ ”آئیے۔“ وہ استانی سے کہنے لگا۔ ”میں آپ کو بورونگ تک چھوڑ آؤں۔“

شہزادی نے ایک مرتبہ حرمت سے ایلی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ایلی خالی دھمکی دے رہا ہے۔

”طلاق تمہیں مل جائے گی۔“ ایلی نے دہرا�ا۔ ”خراج بھی ملتا رہے گا۔ حسب توفیق۔“

”لیکن آپ جائیں گے کہاں۔ اس وقت۔“ استانی نے پوچھا۔

”میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا جہاں اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود وہیں“

دن کے بعد بلا وجہ طلاق مانگی جائے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

شہزادوں بازوکوہوں پر رکھ کر صحن میں کھڑی ہو کر ایلی کو گھورنے لگی۔
”ایمانہ کیجئے۔“ استانی نے کہا۔

”تو کیا یہاں رہ کر بے عزتی کی زندگی بس کروں۔“ وہ بولا۔

”اب تو عزت والے بن بیٹھے ہو۔“ شہزاد چلانی

”لڑنا بیکار ہے۔“ وہ بولا۔ ”صرف ایک بات پوچھتا ہوں گیا تم طلاق مانگتی ہو۔ تم
چاہتی ہو کہ نفیسہ طلاق لے لے۔“

”چاہتی،“ وہ غرائی۔ میں وہیوں گی کہ کیسے نہیں ہوتی طلاق،“ اس کی کیا وجہ
ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ غرائی۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کوئی تعلق نہیں تو خدا حافظ۔“ ایلی باہر نکل گیا۔

”ابو۔ ابو۔“ عالی سوتے سوتے جاگ پڑا ”ابو۔“ وپ رو رپا تھا۔ ایلی
بھاگ رہا تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں عالی کی چیزیں سن کر وہ واپس جانے پر مجبور نہ ہو
جائے۔ ابو۔ ابو دو را یک چکی ہونک رہی تھی۔

ابو۔ ابو میں نہ جانے کدھر جا رہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں سرد بائے چپ چاپ ڈبے
میں بیٹھا تھا۔

انجام

کہاں جاؤں

ایلی چپ چاپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر اندر ہیرے کو گھور رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک وسیع خلائیں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

شہر اور خدا حافظ کرنے کے بعد وہ بلا سوچے سمجھے شیشیں کی طرف چل پڑا تھا۔ آدمی رات کا عالم تھا۔ اس وقت وہ ریلوے شیشیں کے سوا کہاں جاستا تھا۔ اس لئے ان جانے میں وہ ادھر چل دیا۔ اور بالآخر پہنچ کر پلیٹ فارم کے پیش پر بیٹھ گیا۔

پھر نہ جانے کب گاڑی آئی اور لکھ لئے بغیر سوچے سمجھے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور وہ بہت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے شانے پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ چونکا۔ پاس ایک وردی پوش بابو کھڑا تھا۔

ایلی نے بابو کی طرف دیکھا۔

”لکھتا ہاں نے کہا: ”لکھ۔“

”لکھ۔“ ایلی نے تعجب سے دہرا یا۔

اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہے۔

”ہاں لکھ۔“ ایلی نے پھر دہرا یا اور جیب ٹوٹ لئے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس کے پاس تو کوئی لکھت نہیں ہے۔

”لکھ تو نہیں۔“ وہ بولا۔

”کہاں جانا ہے۔“ بابو نے پوچھا۔

”شاہوال سے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”جانا کہاں ہے۔“ بابو چلایا۔

”یہ گاڑی کہاں جائے گی۔“ ایلی نے پوچھا۔

بابو نے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جانا ہے۔“

”مجھے، وہ بولا۔ مجھ تو کہیں بھی نہیں جانا۔“

اس کے ہمراہی مسافر قہقہہ مار کر فنس رہے تھے۔

”تو گاڑی پر سوار کیوں ہوئے۔“ بابو بولا۔

”پتہ نہیں۔“ ایلی گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔

”کرایہ نکالو۔“ بابو نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

ایلی نے جیب ٹوٹلی۔ اس کی جیب میں صرف سات روپیں تھیں۔

”میرے پاس صرف یہ ہیں۔“ ایلی نے کہا۔

بابو نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”تم عادی ہے لگنے لظر نہیں آتے۔“

”جی نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”میری طبیعت صحیک نہیں۔“

”اچھا تو پھر اگلے شیش پر اتر جانا۔“

”جی اچھا۔“

بابو نے اپنی کاپی ہند کر لی اور چپ چاپ بیٹھا۔ ایلی پھر اپنے خلا میں کھو گیا۔

اگلے جنکش پر بابو نے اسے پھر جنجنھوڑا۔ ”چلو اترو۔“ وہ بولا۔

ایلی نے سوت کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

”اب کہاں جاؤ گے۔“ بابو نے پوچھا۔

”پتہ نہیں ایلی نے جواب دیا۔“

”والپس شاہوں کیوں نہیں جاتے۔“

ایلی نے لفی میں سر ہلا دیا۔

پھر وہ پلیٹ فارم پر ایک نیچ پر جا بیٹھا۔ بابو اسے دور کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی چل

پڑی۔ ایلی جوں کا توں بتنا بیٹھا۔ یہ دیکھ کر بابو پھر سے گاڑی پر چڑھ گیا۔

دیر تک ایلی و ہیں بیٹھا رہا۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر ایلی چونکا۔ ذہن میں حرکت سی ہوئی۔

”ابو ابو____ عالی اس کی طرف ہاتھاٹھائے رورہا تھا۔

پھر دھند لکھے ایک شکل ابھری: ”تم نے میری بیگی کو بیجا ہے۔“ کوئی چلائی۔
ایلی نے محسوس کیا جسے کسی نے اس کے سینے میں کثارتی بھونک دی ہو گھبرا کر اٹھ
بیٹھا اور چانے کے ہٹال پر کھڑا ہو کر چانے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں میں
کہاں جاؤں؟
اس کے رو برو محمود اکٹھا جوں ”اوہبُوں“ وہ بولتا ”غصے میں نہ آؤ۔“
”محمود۔“ کسی نے اس کے کان تیک کہا۔ ”محمود جو ہے۔“
”اوہبُوں۔“ ایلی نے نغمی میں سر ہلایا۔

علی پور-رفیق-خانپور____ اس کی کانوں میں آوازیں آئے لگیں لیکن وہ نہ
تو علی پور جانے کے لئے تیار تھا نہ لاہور نہ خانپور۔

”کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں؟“ گاڑی ہو گئی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی
تھی۔

ایلی کی توجہ گاڑی کی طرف منعطف ہو گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔
گاڑی کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر دھند لی دھند لی بتیاں جھلما رہی تھیں۔ سافر
کمبلوں اور چادروں میں لپٹے اوںگ رہے تھے۔

دقعاً اس کی نگاہ گاڑی کی پلیٹ پر پڑی: ”راجو اڑہ پنجبر۔“

”راجو اڑہ۔“ اس نے محسوس کیا جیسے وہ نام ما نوں ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر خلیق
اس کے رو برو آ کھڑا ہو:

”الیاس صاحب۔ کبھی میرے پاس راجو اڑہ آؤ۔“ وہ مسکرا یا۔

”ہاں۔“ ایلی کو یاد آیا۔ اس کا ماموں زاد بھائی خلیق راجو اڑے کے ہسپتال میں نو

کرتھا۔ ایلی چپکے سے باہر لکلا۔ اس نے راجواڑے کا لکٹ خریدا۔ اور پھر سے اندر آکر گاؤڑی میں بیٹھ گیا۔

بیونڈ ایماندی

ایلی کو دیکھ کر خلیق حیران رہ گیا۔
”ارے الیاس بھائی ہیں۔“ اے یقین نہ آتا تھا کہ الیاس اسے ملنے راجواڑے آیا ہے۔ ”بھکی والوں“ وہ چلانے لگا۔ ”یو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی بے حد مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز الیاس آئیں گے۔ بڑی مہربانی کی بڑی عنایت ہے۔“
دیر تک خلیق چلاتا رہا۔ اطمہن خوشی کرتا رہا۔ پھر فتحا اس نے محسوس کیا کہ ایلی وہ ایلی نہیں نہ جانے کیا بات ہے۔

”لیکن۔“ وہ چلایا۔ ”خیریت تو ہے۔“

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں۔“ خلیق نے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ ایلی نے نامیدی اور مایوسی سے کہا۔

”آپ کی طبیعت تو طھی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائے گا۔ ایلی کو خلیق پر پورا اعتقاد تھا۔ وہ اس بات سیپورے طور پر واقف تھا کہ خلیق کے دل میں ایلی کے لئے محبت ہے اور اس محبت میں احترام کا غصر شامل ہے اور خلیق کسی واقعہ پر بھی ایلی سے بد نظر نہیں ہو سکتا۔ پھر نہ جانے کیوں بات چھپانا چاہتا تھا کہ وہ شہزادے قطع تعلق کر کے چلا آیا ہے۔ اے یہ بات کہنے کی جرات نہ پڑتی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا۔ کہ اس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔

خلیق سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا اور دکھی ہے۔ چپ گلی ہے۔ اس کے بعد وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ جیسے وہ کچھ سمجھا ہی نہ ہو اور ایلی کا دل بہلانے کے لئے اس نے ادھرا دھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

”الیاس صاحب۔“ وہ بولا۔ ”ایسی اچھی جگہ ہے یہ راجواڑہ کہ کیا بتاؤں۔ تاریخی اہمیت کا قصبہ ہے۔ اگر چچھوٹا سا ہے لیکن مطالعہ کے لئے لا جواب شہر ہے۔“ پھر وہ ایلی کو شہر لے گیا۔

”یہ دیکھنے پر راجواڑہ کے محلات میں۔ منہدم ہو چکے ہیں پھر بھی واضح آثار ہیں اور یہ ٹیلہ جو ہے اس کے نیچے منوں سونا اور چاندی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ حکومت یہ آثار کھو دنے پر غور کرو ہی ہے اور یہ دیکھنے پر پرانے باغات ہیں۔ مغلیہ وقت کے کسی زمانے میں یہاں لو رن رہتا تھا۔ بلاے ٹھائٹھ تھے اس زمانے میں راجواڑے کے۔ بے حد زریز جگہ ہے نا اس لئے اتنے باغات تھے یہاں کا سے باغ بستی کہتے تھے۔ یہ نام تو اب رکھا گیا ہے۔ پہلے اسے باغ بستی کہا جاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کا میوہ اگتا تھا۔ لب ایک ہی وقت ہے یہاں سانپ بہت ہیں۔“

ایلی خلیق کی باتیں سنے بغیر ہوں ہوں کہتا رہا اور باغات دیکھے بغیر بہت خوب کہہ دیتا۔ دراصل ایلی راجواڑہ میں ہوتے ہوئے راجواڑہ میں نہ تھا۔ وہ ان دنوں کہیں بھی نہ تھا۔ نہ شاہوال میں نہ کہیں اور۔ اس کے ڈھن میں وہی خلا پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو۔ زگاہ میں چاروں برف ایک دھندر لگھایا ہوا تھا۔ گردو پیش اس دھندر کے۔

میں اونگھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چیزوں میں وضاحت نہ تھی۔ حرکات بے جان اور نرم آلودہ کھائی دیتی تھیں جیسے سلومو و منٹ فلم چل رہا ہو۔ بازاروں میں دو کان دار اونگھتے دکھائی دیتے تھے۔ راہ گیر چلتے نہ تھے بلکہ لڑکھتیا ہستہ آہستہ بے جان بے عزم طبعی طور پر ایلی کے غم کے کوائف ہی مختلف تھے۔ شدت غم میں اس کا ذہن خلا

میں بدل جاتا۔ دفعتاً چاروں طرف دھنڈ لکا چھا جاتا۔ پھر غم بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں گرتا۔ بوند بوند۔ اور وہ بونداباندی لگی رہتی۔ ونوں، ہفتون، ہفتینوں۔

ایلی کو صرف ایک ڈر تھا کہ یہی خلائق راجواڑے میں اس کی آمد کے متعلق کسی کو خبر نہ کر دے۔ اگر اس نے خبر کر دی تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شہزادے منانے نہیں آئے کی لیکن ممکن ہے لوگ اسے سمجھانے کے لئے آجائیں۔ وہ راجواڑے میں صرف اس نے آیا تھا کہ کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ راجواڑے میں ہے۔ اس نے کپور کو بھی کوئی بخانہ لکھا تھا تاکہ شہزادہ وال میں کسی کو علم نہ ہو کہ وہ راجواڑے میں مقیم ہے۔ اس نے اپنی چھٹی کی عرض سراب کے نام بھیج دی تھی۔ جس میں ایک خط ملفوف کر دیا تھا کہ اس کی تختواہ اس کے گھر شہزادہ کو بھجوادی جائے۔ یہ عرض اس نے آرامیم ایس میں پوسٹ کی تھی۔

خلائق ہر وقت ایلی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ ہپتال جاتا تو ایلی کو ساتھ لے جاتا۔ اسے اپنے کمرے میں ٹھاٹا۔ اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا اور اگر اسے کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا ہوتا تو بھی ایلی کو ساتھ لے جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایلی کو اسکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں چونکہ چند ہی روز میں خلائق کو یقین ہو چکا تھا کہ ایلی کی کیفیت معمولی سے بہت بہت کر ہے۔ ڈنی حالت شدید بحران کی غماز ہے۔

رجپال سنگھ

راجواڑے میں پہلا وہ وزاقعہ جس نے ایلی کی توجہ کو خارجہ دنیا کی طرف منعطف کیا راجپال سے متعلق تھا۔ راجپال سنگھ ایک قومی ہیکل سکھ تھا۔ وہ راجواڑے کی ایک بستی میں رہتا تھا۔

ایک روز جب ایلی اور خلائق شام کے وقت کو اڑے سے باہر میدان میں بیٹھے تھے تو راجپال سنگھ آگیا۔ آتے ہی وہ لڑکھڑایا، گرا اور پھر سنجھل کر بیٹھا گیا۔ اس کے

اوسان خطاب ہو رہے تھے۔

ہوا بیاں اڑی ہوئی تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

راجچال بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اس نے ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹھوٹتے ہوئے کہا۔

”اوہ ہوں۔“ راجچال نے گلی میں سر ہلا دیا۔ ”اچھا بھلا ہوں ڈاکدار۔“ وہ بولا۔

”تو پھر بات لکھا ہے۔“

راجچال نے اشارہ کیا۔ ”اوہ بھی بتاتا ہوں۔“

دیر تک وہ ہاتھوں میں تھامے سر تھامے بنیجا رہا۔

”ڈاکدار۔“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”میری جنگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”وہ تو کسی کی زندگی کا بھی نہیں۔“ خلیق فہما۔

”نہیں ڈاکدار۔ یہ اور بات ہے۔“ راجچال بولا۔ ”بات یہ ہے کہ ایک نا ایک رونگ نا گنی مجھے کاٹ کر چھوڑے گی۔“

”نا گنی“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے گلتی سے ایک رونگ اس کے فرگوں مار دیا۔ وہ دونوں نہر کے کنارے کھڑے تھے پر نا گنی اوٹ میں تھی سو مجھے دکھائی نہ دی۔ دکھائی دے جاتی ڈاکدار تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔ ناگ اور نا گنی اکٹھے ہوں تو انہیں اکچھ نہ کہنا چاہئے۔ جو ایک مر جائے تو دوسرا بدله لئے بغیر نہیں چھوڑتا۔ اکیلا ناگ ہو چاہے فر ہو یا مادہ جو چاہے کرو۔ چاہے وہ مر جائے چاہے جنمی ہو جائے۔ کوئی بات نہیں۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا ”تو پھر۔“

”پھر کیا۔ میں نے موقع پا کر ایک لٹھ مار دی۔ نزوہاں چوت ہو گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں ڈاکدار تو بولے کی اوٹ میں مدین نا گنی ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی پسینہ آ گیا۔“

بس ڈاکدار۔ وہ رونج اور آج کارونج ہے۔ جب باہر جاؤں تو مجھے پتہ ہوتا ہے کہ ناگئی دور نہیں۔ کہیں پاس ہی ہے۔ خبردار رہتا ہوں۔ لاٹھی بنا باہر نہیں جاتا۔ ایک ملٹ کے لئے بے خبر ہو جاؤں تو سمجھ لو معااملہ کھتم ہو گیا۔ ”وہ خاموش ہو گیا۔

سچھدیر کے بعد یولا:

”دن کے سے تو کوئی بات نہیں۔ ناگئی چالاک ہے تو اپنے باجوؤں پر جی جور ہے۔ جو پاس آئے گی تو چھوڑتا میں بھی نہیں۔ پر بات جو باہر پڑ جائے تو سمجھ لو پھر وہ مجھے شہر پہنچنے نہیں دے گی۔ آج سچھدیر ہو گئی تھی۔ قدم قدم پمیرے ساتھ رہی وہ۔ میں بھاگا۔ وہ بھی بھاگی۔ بھی سمجھ لو گروہی صہراں ہے جو سلامت پہنچ گیا ورنہ آج کوئی صورت نہیں تھی پہنچنے کی۔“ وہ بے سائز لینے کا۔

”تو میں اس بات میں تمہاری گیا مدد کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”بلس ایک بات ہے۔“ وہ یولا۔ ”وو سلا بیاں اس سرے کی دید و مجھے صرف دو سلا بیاں۔“

”سرے کی۔“ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ وہ جو کمپنی والوں کے پاس سرمد ہے سانپ کے کاٹے کا۔“

”سرمد ہے۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”سانپ کے کاٹے کا سرمد۔“

”ہاں بابو۔“ راجپال یولا۔ ”جس کوناگ کاٹ جائے یا کیڑا سونگ جائے اس کی آنکھ میں سرمد کی سلائی لگادیتے ہیں۔ بس سارا جہر بھسم ہو جاتا ہے۔“

”ارے۔ کیا یہ سچ ہے۔“ ایلی نے خلائق سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ خلائق نے جواب دیا۔

”بالکل سچ ہے ڈاکدار جی۔“ راجپال یولا۔

”تو پھر تم کمیٹی والوں سے کیوں نہیں مانگتے۔“

”وہ نہیں دیتے بابو جی۔ وہ نہیں دیتے۔ ڈاکدار انہیں کہیں تو شاید دے دیں۔“

میرے کہنے پڑیں دیتے۔ ” راجپال نے کہا۔

” اچھا۔ ” اکٹر بولا۔ میں ان سے کہوں گا۔ تم کل پتہ کرنا۔

راجپال کی بات پر پہلی مرتبہ ایلی کا وہ خلاٹوٹ گیا۔ راجپال کی بات نے اس کی تمام توجہ کو سلب کر لیا۔ اس کے دل میں بیسوں سو الات پیدا ہوئے۔ کیا واقعی ماڈلز کا انتقام لیتی ہے؟ کیا وہ دشمن کا پیچھا کرتی ہے۔ کیا سانپ بھی سوچنے کی الیت رکھتے ہیں۔ اور چالاکی سے وار کرتے ہیں۔ کیا سانپ کے کائے کا علاج سرمه بھی ہو سکتا ہے۔

مند کیڑا

سانپوں کی زندگی بیحد پر اصرار ہے، ” خلیق نے کہا۔ ”
” ہاں ” وہ بولا۔ ایلی کو ہاجرہ کا واقعہ یاد کیا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب ایلی علی پور میں شارت پینڈ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس زمانے میں وہ بیشتر وقت شہزاد کے چوبارے میں بسر کیا کرتا تھا۔

ایک روزہ ہاجرہ نیچے تہہ خانے میں اتر گئی اور دیر تک وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک کرتی رہی تہہ خانے میں وہ دوسرے چوتھے روز جایا کرتی تھی۔ انہوں نے گھر کا کاٹھ کبارو ہیں رکھا ہوا تھا۔

ہاجرہ تہہ خانے سے واپس آ کر سیدھی شہزاد کی طرف گئی۔ نہ جانے اسے کیا کام تھا۔ وہ کھڑی باتی کر رہی تھی کہ وقتاً اس نے اپنی شلوار میں کوئی حرکت محسوس کی اور اپنا ہاتھا دھر بڑھایا۔ پھر ہاجرہ نے ایک لمبی جخی ماری اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ ایلی اور شہزاد جیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جخسن کر رابعہ اور جانوبہ اگی بھاگی اور پاؤں میں۔

وہ سب ہاجرہ کی طرف لپکے۔

” ہاں گئیں۔ ” وہ جیران رہ گئے۔ ہاجرہ کا منہ نیلا ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے نیلی سیاہی

انڈیل دی ہو۔ چند رہی منشوں میں سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔“ محلے والیاں چلانے لگیں۔

”ہے۔ یہ تو نیلی ہو گئی۔“ ایک بولی۔

”لیکن ہوا کیا ہے بہن؟“

”کیا پتہ کیا ہوا ہے بہن ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہے۔“

”ہے۔ وہ تو نیلی پڑ چکی ہے۔ سانپ سنپولتے نے تو نہیں دیکھا۔“

”پتہ نہیں۔“ شہر اد بولی۔ ”ہم نے تو نہیں دیکھا۔“

”ہے۔ ابھی تو جل تھی تیرہ خاتے سے۔“ فرحت روتے ہوئے بولی۔

ایک نے بڑھ کر باجرہ کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ کچھ لوگ ڈاکٹر کی طرف بھاگے۔

کچھ دری کے بعد ڈاکٹر آگیا۔ کیا سوہ مریضہ کو دیکھ کر رک گیا اور دوسری سے دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا؟“ وہ بولا۔

”کچھ پتہ نہیں۔“

”چیخ مار کر گری پڑی اور پھر نیلی ہو گئی۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”بہت زہریلا سانپ معلوم ہوتا ہے۔ کس نے دیکھا ہے کیا؟“

”نہیں۔“ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

”نا نگ نگلی کرو۔“ ڈاکٹر چلایا۔

انہوں نے باجرہ کی شلوار کے پانچے اور پر کر دیئے۔ باعثیں نا نگ پر کچھ جگہ یوں ابھری ہوئی تھی۔ جیسے پھوڑا سانکلا ہوا ہو۔ ڈاکٹر نے ایک تیز چاقو سے وہ پھوڑا کاٹا۔ چاہا لیکن چاقو لگتے ہی پھوڑا یوں کٹ گیا جیسے کیلا ہو۔ ڈاکٹر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

”ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“ وہ چینچنے لگا۔ ”کوئی مریضہ کے جسم کونہ چھوئے۔ انھوں۔“ وہ اس عورت سے مخاطب ہوا جو باجرہ کا سر گود میں رکھے بیٹھے تھی۔ ”اٹھو۔“

ورنہ ذہر تمہیں بھی چڑھ جائے گا۔“

اس عورت نے ڈر کر ہاجرہ کا سر نیچے دھکیل دیا۔ اور خود اٹھنے کی وکشش کی لیکن اس کے دھڑ میں سکت نہ رہی تھی۔ اس پر لوگوں کی توجہ ہاجرہ سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو گئی۔ چار عورتوں نے اُسے اٹھایا اور اندر رچا رپائی پر ڈال دیا۔

ڈاکٹر بولا: ”اُسے فوراً دفننا دو۔ ورنہ کچھ دیر کے بعد اس کا جسم پھٹے گا اور جہاں جہاں چھینئے پڑیں گے وہاں وہاں زہر پہنچے گا۔ لے جاؤ لے جاؤ۔“ وہ چلا یا۔ ”سب چلی جاؤ۔ مریض کے پاس کوئی نہ ٹھہرے۔“

ڈاکٹر کے جانے کے بعد سب عورتیں بھاٹ گئیں۔ صرف شہزادی ایلی فرحت رابعہ اور جانورہ گئے۔ وہ سب ایک دوسرے کامنہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ ہاجرہ کا رنگ سیاہ ہو چکا تھا اور اس کے جسم کا گوشت گویا ابل رہا تھا۔ عین اس وقت ایک پسیر اسیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گیا۔

”کس کو کاٹا ہے کیڑے نے۔“ وہ بولا۔

ایلی نے حیرانی سے پسیرے کی طرف دیکھا۔ اب کیا کرے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ پسیرے کی نگاہ ہاجرہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ایک وحشت بھری مسکراہٹ چمکی۔ ہا۔..... وہ دیوانہ وار چلا یا۔ اس نے اپنی پچھی نیچے پھینک دی۔ ”آج تو نند کیڑا کے درسن ہو گئے۔ ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“ وہ چلانے لگا۔

سب سہم کر پیچھے ہٹ گئے۔

”کوئی سونما دو۔“ وہ بولا۔

”جاو۔ دو دھنگلی اور کالی مرچ کا انتظام کرو۔ یہاں کوئی نہ رہے۔ گروچا ہے تو دو دھنگلی اور پانی کا پنی ہو جائے گا۔“

پسیرے نے سب کو چوبارے سے باہر نکال کر افر سے کنڈی لگالی اور بیٹھ کر نہ جانے کیا جنتر منتر پڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سوٹی تھی۔ سامنے دو دھنگلی کا بھرا

ہوا برتن تھا۔ وہ بار بار سوٹی سے ہاجرہ کو چھوٹا۔ اور پھر چند ایک مرتبہ چھوٹے کے بعد سوٹی کو دودھ میں ڈال دیتا۔ اس وقت عجیب سی آواز پیدا ہوتی جیسے میں سرخ کئے ہوئے لوہے کو پانی میں ڈالتے ہیں تو پیدا ہوتی ہے۔ کوئی دو گھنٹے تک وہ ہاجرہ کی لاش کے پاس بیٹھا وہی عمل دھراتا اور منتر پڑھتا رہتا۔ پھر دفلٹا ایک لمبی چیخ سنائی دی۔ ایسی ہی چیخ جیسی ہاجرہ نے بے ہوش ہوتے وقت ماری تھی۔ چیخ سن کروہ سب بھاگ کر کھڑکیوں میں آ کھڑے ہوئے۔ ہاجرہ کارنگ سیاہ نیلا ہو چکا تھا۔ ہلکا نیلا۔ اور وہ حرکت کر رہی تھی۔

پسیرا چلا رہا تھا۔ آیا آیا۔ گروہ کی دیا سے نندگیٹرا کا بھوشن مل گیا۔ ہاہا ہاہا۔ ”سامنے پڑا ہوا دودھ کا کشورہ سیاہ ہو چکا تھا۔ پسیرے کے ہاتھ کی چھڑی بھی اگے سرے سے جلی جلی دکھائی دے رہی تھی۔“

ناگ دیوی

چار ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے اسے اٹھا کر اندر چار پالی پر ڈال دیا۔ پسیرا اپنی گھڑی سنجال رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ پھر اس نے پیغمبئی سے ایک بڑی ہی ڈبیز نکالی اور دو لکڑیوں کی مدد سے ہاجرہ کی ناگ کا وہ پھوٹا اٹھا لیا۔ جسے داکڑ نے قبیچی سے کاٹا تھا۔ پسیرے نے گوشت کا وہ لکڑا جوا بھی تک سیا تھا اٹھا کر ڈبیز میں ڈال لیا۔

”تمہاری کیا خدمت کریں؟“ ایلی نے باہر نکل کر پسیرے سے کہا۔

”تم کیا سیوا کرو گے با بیو۔“ وہ بولा۔

”پھر بھی۔“ ایلی نے کہا۔

”انہوں۔“ پسیرا مسکرایا۔

”کچھ تو لے لو۔“ شہزادے پانچ دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

”لڑ کی تمہیں تو صرف بڑھیا کا جیون ملا ہے پر مجھے گروکنی دیا سے ساری جیون شکستی

مل گئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔“ اس نے اپنی ڈبیا کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

دفعتاً وہ رک گیا۔ ”اے لڑکی۔“ وہ بولا۔

”کیا ہے۔“ فرحت نہ کہا۔
”تو نہیں۔“ وہ بولا۔“ یہ جودو سری والی ہے۔ ذرا منہ میری طرف کرو۔“
شہزاد نے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ شہزاد کے ماتھے کے تل پر پڑی۔
”آہا۔“ وہ بولا۔“ تیرے تو ماتھے پر نندی بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی
ہے۔ یہ لے کیا یا دکھرے گی کہ سپیرے نے کیا وان کیا تھا۔“ اس نے ایک اور ڈبیہ
سے چند سیاہ مرچیں نکالیں اور شہزاد کے باتحہ پر لٹک کر بولا۔ انہیں کھالے۔ ابھی
کھا۔“

شہزاد نے فرت سے ان گندی مرشوں اور سپیرے کے غلیظ ہاتھوں کی طرف دیکھا
اور پھر پچکچاتے ہوئے دو مرچیں منہ میں ڈال لیں۔

سپیرے کے جانے کے بعد اس نے قبی مرجیں پھینک دیں۔

ہاجرہ رو بصحبت ہونے لگی۔ سپیرے کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ وہ اسے دو دفعہ
اور کچھی پلاٹتے رہے۔

جب وہ تندروست ہوئی تو خود ہی کہنے لگی: پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس روز بے ہوش
ہونے سے پہلے میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ایک لٹھمیرے سر میں دے
ماری ہو۔ پھر پتہ نہیں مجھے کیا ہوا۔ پھر جب میں ہوش میں آئی تھی تو بھی میں نے
محسوں کیا تھا جیسے کسی نے لٹھمیرے سر پر دے ماری ہو۔“

ہاجرہ بالکل صحت مندو ہو گئی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک اگر اسے کوئی بھڑیا
کوئی زہر یا جانور کا نہ تا تو معامر جاتا اور ہاجرہ کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر ایک روز ان کالی مرچوں کے دان کے اثر کا راز بھی کھل گیا جو سپیرے نے

شہزاد کو بطور تخفہ دی تھیں اور جن میں سے شہزاد نے صرف دو تین چبائی تھیں۔

ایک روز شہزاد کی انگلی پر بھڑکاٹ گئی۔ شدت درت سے بلبلہ اٹھی۔ اتفاقاً اس نے وہ انگلی منہ میں والی۔ ففتا درد غائب ہو گیا۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔ اس کے بعد نہ تو انگلی سوچی اور نہ ہی درود ہوا۔

پر ایک روز ریحانہ کو بھڑک نے کاٹا تو شہزاد نے آزمائے کے لئے اس جگہ اپنا لب لگا دیا۔ ریحانہ کو فوراً آرام آگیا۔ پھر ففتا اسے خیال آیا کہ شاید ان کا لی مرچوں کا اثر ہوا اور وہ فسوس کرنے لگی کہ اس نے ساری مرچیں کیوں نہ کھا تھیں۔

ایلی کو وہ سب واقعات یاد آئے گے۔ اس کی نگاہ تینے شہزاد آنکھڑی ہوئی۔ اس کی پیشانی پر وہ گہرا شرتی تلیوں روشن تھا جیسے دیا جمل رہتا ہو۔ پسی را رک گیا: میری طرف دیکھ لڑ کی۔ ”وہ بولا۔ ”ترے مانتھے پر تو نندبندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔“

پھر شہزاد شاہوال کے گھر میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ لہو پر کر رہے ہوئے تھے۔ مانتھے کی بندی گل و چکی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں انگاروں کی طرح دیکھ رہی تھیں۔

”میں دیکھوں گی کس طرح تم اسے طلاق نہیں دلواتے۔“

یہ شہزاد اس شہزاد سے کس قدر مختلف تھی۔

شاید وہ محض ایک رنگی محبوبہ تھی۔ اس میں بیوی بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا۔ اس روز پہلے دن اس نے شہزاد کے متعلق سوچا تھا۔ ورنہ جب سے وہ راجواڑے آیا تھا اگر اسے شہزاد کا خیال بھی آتا تو اس قدر دکھ محسوس ہوتا کہ وہ اس خیال کو دل کی اتھاگہ ہائیوں میں دبادیتا۔ اس روز رات کو سونے سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کی جیخ جیخ کر رہا ہے لیکن خلیق کی موجودگی مانع تھی۔ اس لئے اس نے چپکے چپکے چند آنسو بھائے۔ بہر صورت وہ جمود جو اس پر طلا ری تھا ٹوٹ گیا اور وہ

وہی خلاسمٹ کرنا پیدا ہو گیا۔

مادہ کا انتقام

اگلے روز چائے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کمیٹی کے سیکرٹری کے گھر چلے گئے۔ راجواڑے کی میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کا نام حافظ عبد الجید تھا۔ وہ چالیس برس کے ہوں گے۔ قد درمیاں خدوخال پر وضع داری کے جملہ نشانات واضح تھے۔ انداز میں روایات پرستی کی واضح جھلک تھی۔ وہ احتیاط سے چلتے۔ احتیاط سے بات کرتے اور احتیاط سے سوچتے تھے۔ خلیق نے کچھ دیر بعد مطلب کی بات پھیٹری بولا:

”حافظ صاحب۔ کیا آپ کے پاس سانپ کے کانے کا سرمه ہے یعنی“
،،خلیق نے اپنی بات کیوضاحت کرنے کے لئے کچھ اور کہنا چاہا۔

”ہاں ہاں“ حافظ بولے

”حیرت ہے۔“ خلیق بولا۔ ”کہ سرمد لگانے سے سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔“

”آجی صاحب۔“ وہ بولے۔ ”ساری بات ہی عجیب ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ آج سے چار سال پہلے ہمیں حکومت کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے ساتھ ہی حکیم محمود علی کا اشتہار ملفوظ تھا۔ اشتہار میں اس سرے کے متعلق مرقوم تھا کہ اس کی سلائی لگانے سے سانپ یا بچوں کا زہر یا تو اثر نہیں کرتا اور اگر اثر ہو چکا ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خط میں لکھا تھا کہ ہم اس سرمد کو خریدنے کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔ چونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سرمد کا اثر فوری ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ہم تالوں، سکولوں اور کمیٹی گھروں کو یہ سرمد خریدنا چاہئے۔

”آپ جانتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ حافظ صاحب بولے۔ ”کہ ایسے سرکاری خط آیا ہی کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہو یہی حکیم محمود کا کار و بار چلانے میں مدد

دینا مقصود ہے۔ چونکہ ساری بات ہی کامل تھی بھلا آنکھوں میں سر مالگانے کو سانپ کے کائے سے کیا تعلق۔

”بالکل بالکل۔“ خلیق ہنسنے لگا۔

”ہے تا“ حافظ صاحب بولے۔ ”تو صاحب ہم نے گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ووشیشیاں خرید لیں اور وہ عرصہ دراز تک گھر جوں کی توں پڑی رہیں۔“

”ایک رات دو بجے کے قریب بیگم صاحب اخیں تو انہیں سانپ نے کاٹ لیا۔ اب اس وقت کیا کیا جاسنا تھا۔ ہم نے ناگ تیل بھی لگادیکھا۔ پچھا فاقہ نہ ہوا۔ پھر مجھے سرمه یاد آیا میں نے کہا۔ چلو اسے بھی آزماؤ کیوں ہو۔ حق جناب میں نے ان کی آنکھوں میں ایک سلامی لگادی۔ سلامی لگنے کی دریتی کوہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ درود گویا کا نور ہو گیا۔ اس روز میں سمجھ میں آیا کہ یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ سو جناب ہم نے کمیٹی کی طرف سے ڈونڈی پٹوادی کہ کسی شخص کو بچھویا سانپ کاٹ لے تو وہ ہمارے پاس پہنچ جائے صاحب میسوں مریض آئے اور ایک ایک سلامی ڈلوانے کے بعد یوں اپنے پاؤں پر چل کر گھر لوئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔“

”تو کیا بھی آپ کے پاس وہ سرمہ ہے۔“ خلیق نے پوچھا۔

”اوہ ہوں۔“ حافظ صاحبت بولے۔ ”ختم ہو گیا۔ شاید ایک آدھ سلامی نکل آئے۔ اب جی ڈاکٹر صاحب ہم نے حکیم محمود علی کوئی ایک خط لکھئے، تاکہ اور شیشیاں بھیجے لیکن تمام خط ڈی ایل او کے ذریعے واپس آگئے۔ داکئے نے ان پر تحریر کیا ہوا تھا کہ ایسے نام کا کوئی شخص بھائی دروازے میں رہائش نہیں رکھتا۔ لہذا خط واپس کئے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ حکیم محمود علی صاحب کیا ہوئے اور ان کا مطبع کیا ہوا۔ ہم نے بڑی تحقیق کی لیکن بے فائدہ۔“

خلیق نے پھر راجپال کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حافظ صاحب بولے:

”ہاں وہ ہمارے پاس بھی آیا تھا لیکن دوائی پہلے دے دینا یہ چیز ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اگر سانپ اسے ڈس لے اور وہ یہاں پہنچ جائے تو میرا خیال ہے ایک سلائی سرمہ تو نکل ہی آئے گا۔“

چار ایک روز بعد شام کو آٹھویں کے قریب راجچال کے بازار میں چورچ گیا۔
راجچال آرہا ہے۔ راجچال آرہا ہے۔“

جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو اس کا منہ سونج چکا تھا۔ انگھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کتنی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ دیر تک وہ نصیلی دیوار لگ کر کھڑا رہا۔ پھر اک عزم سے دوڑنے لگا۔ لالہ رام داس کی دکان پر وہ گھمکی طرف چھپتا اور کچھی پینے لگا۔ اتنے میں اس کے گرد بھیر لگ چکی تھی۔ لوگوں چواروں طرف سے دوڑتے تھے۔ ایک آدمی حافظ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر کے پاس۔ کچھی پینے کے بعد اس نے پھر ہمت کر کے بھاگنا شروع کیا لیکن چند ہی قدم اٹھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا اور پھر چکر کھا کر دھڑام سے بازار کے عین وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں حافظ صاحب بھی عین موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سرمے کی ایک سلائی اس کی آنکھوں میں ڈالی۔ راجچال کا جسم یوں تڑپنے لگا جیسے کاشاث لگ گیا ہو۔ پھر اس نے آنگھیں کھول دیں اور وہ خیال نہ اداز سے نعرہ لگایا۔ وہ گرو۔“

ایلی نے اس وقت محسوس کیا جیسے اس پر بھی سانپ کا ٹੀکا اڑختم ہو گیا ہو۔ س کا بھی جی چاہتا تھا کہ زور سے نعرہ لگائے۔ ”واہ گرو۔“

اگلے روز خلیق نے دیکھا کہ ایلی کی پرانی شخصیت پھر سے استوار ہو گئی ہے اور اس کا وہ ذہنی وجود ختم ہو چکا ہے تو اس نے بات چھیڑی۔

”شکر ہے اب آپ کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ میں تو ڈر رہی گیا تھا۔“
”وہ ہنسنے لگا۔“

صورت حال بڑی خطرناک تھی۔ ”ایلی نے کہا۔
”اچھا۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”آخر بات کیا تھی؟“
”مجھے بتانے میں تو کوئی حرج نہیں۔“

رسوائی

ایلی کا قصہ سننے کے بعد خلیق خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ محسوس کر رہا تھا اس لمبی چوڑی
و استان کا یہ انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خلیق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس
نے زبان سے سچھنے کہا۔
خلیق طبعاً کہنے والا شخص نہ تھا جو خاموشی سے محسوس کرنے کا عادی تھا۔ اس نے
بصد مشکل آنسو پی لئے اور بولا: ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اپنے معاملات کو بہتر
سمجھتے ہیں۔“

پندرہ روز راجواڑے ٹھہر نے کے بعد ایلی خلیق سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک ایسی
گاڑی میں سوار ہوا جورات کے ایک بیچ شاہوال پہنچتی تھی۔ شاہوال پہنچ کروہ
سیدھا کپور کے گھر گیا۔ حالات کو جاننے کے لئے وہ کسی اور کے پاس نہ جا سکتا تھا۔
ریاض سے وہ گھبرا تا تھا۔ ناظم سے مذاشکل تھا۔ اور بورڈنگ میں جانا مناسب نہ
تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکے اسے پہچان لیں گے اور پھر آپس میں با تین کریں گے۔
کپور سے دیکھ کر گھرا گیا:

”ایس بھائی۔ تم کہاں آؤ آؤ۔“ ”وھ تاوہ رک گیا۔“ لیکن نہیں۔ یہاں نہیں۔
کوئی تمہیں دیکھنے لے ٹھہر و میں ابھی آیا۔“

کپور چند منٹ کے بعد باہر نکلا۔ ”آؤ آؤ۔“ وہ بولا ”باہر جا کر بات کریں گے۔
”اور وہ دونوں چپ چاپ شیشیں کی طرف چل پڑے۔“ ”ٹھنگ روم میں بیٹھ کر کپور
ایلی پر بر س پڑا:

”تم نے یہاں سے جانے میں بڑی شیدید غلطی کی ایلی۔ تم نے میدان خالی چھوڑ

دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمہاری بیوی نے وہ اوپلا مچایا۔ تمہارے خلاف اس قدر زہرا گلکے شاہوال کا ہر اہلکار تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔ پولیس کے افسروں نے حکم دے دیا ہے کہ تمہیں حرast میں لے لیا جائے۔

محض یہ تمہاری بیوی کا قصہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ سراب تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر تمہارے حق میں نہیں۔ سارے شہر میں تمہارے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ تمہیں ماریں گے۔ ان سب کو یقین ہو چکا ہے کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا۔ اور اس کی اور اس کی ماں کی مر جی کے خلاف نہ موہقی اس کی شادی کر دی تھی اور پھر تم بھاگ کرو پوш ہو گئے۔ اس سے ان کا یقین اور بھی پکا ہو گیا۔

”کیا تمہارا بھی یہ خیال ہے۔“ ایلی نے کپور سے پوچھا۔

”میری بات چھوڑو۔ میرا کیا ہے۔“

”میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ جانے سے پہلے بتاتے۔ اب کیا فائدہ تو تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ تمہاری گھر گھر رسوائی ہو چکی ہے۔ لوگ اور اہل کار تمہیں بد معاش سمجھتے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں جو اے۔ ایس۔ آئی رہتا تھا وہ ان کی امد اور رہا ہے۔“

”حد ہو گئی۔“ ایلی نے کہا۔

”حد سی حد ہوئی ہے۔“ کپور کہنے لگا۔ ” حتیٰ کہ ریاض بھی مخالف پارٹی میں شامل ہو چکا ہے۔ صرف ناظم کو تم سے ہمدردی ہے لیکن وہ بھی کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

”اوہ تو پھر ہو گیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر بھی تم تاریخ پر تو یہاں آؤ گے ہی۔“ کپور نے کہا۔

”کیسی تاریخ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”تمہارے خلاف دو مقدمے درج ہو چکے ہیں۔“ کپور بولا۔

”اوہ۔“ ایلی بولا۔

”خبردار رہنا۔ جب بھی تم آؤ گے کسی نکی بھانے تمہیں حوالات میں بند کر دیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اس بارے میں کھلم کھلا تمہاری مددیں کر سکے گا۔“ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ راجپال ہوا اور اسے مادہ نے ڈس لیا ہو۔

”ہم تو میں یہی ایک گام کر سکتے تھے جو ہم نے کر دیا۔“ کپور نے کہا۔ ”سراب صاحب تمہارے خلاف مجھے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑے میں نے کہا کہ ایسا کہتے تھے۔ وہ کہتے لگا کہ ہم اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تو بلکہ اچھا تھا۔ چونکہ یہاں تمہارہ رہنا ممکن نہیں رہا۔ سو بھائی۔ میں نے ان سے کہا کہ رپورٹ نہ کیجئے میں ویسے ہی اس کا تباولہ کراؤں گا۔ سو میں ایک روز کے لئے لاہور چلا گیا اور لوگوں سے مل ملا کر میں نے تمہارا تباولہ کر دیا ہے۔“ ”کس جگہ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”قاضی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں کا ہیڈ ماسٹر شریف آدمی ہے اور وہ جگہ لاہور کے قریب ہے۔“

”تو میں یہاں چارج کیسے دوں گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ کپور نے کہا۔ ”ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ لکالا: ”یہ لو یہ تمہارا آرڈر ہے اور اس پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ تمہیں یہاں سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ سیدھے قاضی پور جا کر ڈیوٹی سنچال لو۔ اگر چھپر ہے تو معاملہ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔“

کپور سے جدا ہونے کے بعد ایلی گویا بالکل تنہارہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کا ساتھ دے۔ ایک بار

پھر وہ فکر میں ڈوب گیا۔ لیکن اب کی باراں کا ذہن خالی نہیں تھا۔ اس میں میں یوں سوال بھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور گاڑی قاضی پور کو جارہی تھی۔

کوڑھی

قاضی پور پہنچ کر وہ سید حافظ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے وہ آرڈران کے سامنے پیش کر دیا اور کہنے لگا:

”درستے میں حاضر ہونے سے پہلے میں آپ کو اپنے حالات سے واقف کرنا چاہتا ہوں۔“ اتنی سی تمہید کے بعد اس نے اپنی رومدار مختصر طور پر انہیں سنادی۔

”ہوں۔“ اس کا قصد ان بر انصاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ ایسا کے لئے کوئی ہمدردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن آنفی صاحب ”وہ بولے۔“ میں اس بارے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”آپ میری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لئے مجھے برداشت کر لیں۔“ ایسا کہا۔

”کیا مطلب۔“

”مجھے یہاں اپنے مسکول میں رہنے دیں۔“

وہ بنے۔ ”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تو آپ شوق سے ہمارے درستے میں کام کریں۔ لیکن الیاس صاحب! ایسی گڑبوڑ سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔“

قاضی پور پہنچ کر ایسا کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ وہ با تینی جن سے وہ لوگوں کی توجہ جذب کیا کرتا تھا ختم ہو گئیں۔ اپنے اردوگردا ساتھ کی بھیڑ لگانے کی بجائے وہ جان بو جھوکران سے دور رہتا۔ جماعت میں چمکیلی۔ با تینی کرنا بھی چھوٹ گیا۔ وہاں بھی خاموش رہتا اور ہڑھانے میں کوئی دلچسپی نہ لیتا۔

اسے شاہوں سے لخڑاں خبریں آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنا بڑا

محاذ اس کے خلاف کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ آخر شہزاد کا مقصد کیا تھا۔ اس نے جو احتجاج کیا تھا اس کی بنیاد کسی غلط بات پر استوار نہ تھی۔ شہزاد اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے نفیسہ کی شادی ذاتیات کی بناء پر نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی نے اسے بیچا نہیں تھا۔ پھر وہ کیا چاہتی تھی۔ کیا اس کا مقصد ایلی کو رسوا کرنا تھا۔ یا ڈر ادھم کا کراپنے تابع کرنا تھا۔ لیں کی جرات ڈر کے جذبے پر استوار تھی۔ جوں جوں خطرہ برداشت اجاتا اور بچاؤ کی کوئی صورت نہ دکھائی نہ دیتی توں توں وہ ٹھر ہوتا جاتا تھا۔

پولیس اور کورٹ اس کے لئے خطرناک مقامات تھے۔ اس وقت اس کے سر پر قید کا خطرہ اتنی وضاحت سے منڈلا ریا تھا۔ گرفتی طور پر وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ قید ہو جاؤں گا تو کیا ہو۔ وہ سوچتا۔ لیکن ڈر کی وجہ سے کسی کے تابع نہیں ہوں گا۔

جب اسے اپنی رسوای کا خیال آتا تو وہ دل مسوں کر رہا جاتا۔ اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ شہزاد نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچتا۔ پھر اس کی نگاہ میں وہ پولیس آفسر آ جاتا جو شہزاد کے پڑوں میں رہتا تھا۔ شہزاد اس کے قریب آئیتھی اور آنسو بھاتی۔ لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں۔ نہتیں، تھقہے لگاتیں اور معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ ایلی کو دھپکا لگتا۔ شہزاد سے اسے ایسی توقع نہ تھی۔ قاضی پور کا وہ زمانہ ایلی کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کامل یقین تھا کہ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہیڈ ماسٹر جس کے روپ رہا اس نے خلوص سے تمام واقعات ہمدردی حاصل کرنے کے خیال سے دہرانے تھے وہ اصفی محلے میں لوگ اس کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے دوست اور رشتہ دار بھی اعلانیہ اس کے خلاف ہو چکے تھے۔

اس کے مکان پر وحشت برستی تھی۔ وہ مکان جو قاضی پور میں اسے رہنے کے لئے ملا تھا بہت وسیع تھا۔ اس میں کئی ایک کمرے تھے اور اس کا جملہ سامان ایک سوٹ

کیس پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ چارپائی۔ خوش قسمتی سے وہ گرمیوں کے دن تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ مکان میں مالک مکان کا ایک ٹونا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس پر رات کو پر کرسور ہتا۔ سارا دن بھی وہ اسی تخت پوش پر بیٹھا سوچتا رہتا۔

دو مرتبہ اس کے نام شاہوال سے سمن آچکے تھے۔ مدرسہ کے فترشاف کی مہربانی سے ان کی تعیین نہ ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک روز اسے شاہوال جانا ہی پڑے گا۔

تیسرا مرتبہ جب سمن آئے تو ساتھ ہی ایک اور مصیبت روئنا ہوئی۔ اس روز جب وہ صبح جا گا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر اور بازوؤں پر ایک زیماں کے چھالے نکل آئے تھے۔ ایسی ہی پھنسیاں جو امرتسریں اس کے چہرے پر نکلی تھیں۔ جب وہ پھنسیا پھٹ گئیں اور اس کے ہاتھوں کی جلد اتر گئی۔ ہاتھوں کے زخموں سے پانی رستے لگا۔ اس نے حیرت سے آئے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا سمن کی تعیین کرنے شاہوال جا رہا تھا۔ اس کیدنوں ہاتھ بیکار ہو چکے تھے۔ ان پر چیباں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس نے دونوں بازو اور اٹھار کے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اسکی نگاہوں تلے سارا شاہوال پلیٹ فارم پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں سونٹے تھے۔ ان کے پیچے پولیس والے چھکڑیاں اٹھائے کھڑے تھے۔

”ملکت بابو ملکت۔“ ریلوے کا ایک وردی پوش ٹیٹی کی طرف دیکھا۔ ملکت اس کی جیب میں تھا لیکن اس کے ہاتھ بیکار تھے۔ وہ ملکت نکال نہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے۔

”بے نگران ہے۔“ بابو مسکرا یا۔

”جی نہیں“ وہ بولا۔

”تو پھر دکھاؤ۔“

اس نے اپنی جیب شیشی کی طرف کر دی۔ ”اس جیب میں ہے۔“
لیٹی نے مخدوش نگاہوں سے اس کی طرف ندیکھا۔

ایک ہر ایسافر نے بات سمجھ کر ایلی کی جیب میں سے نکٹ نکالا۔
”کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھوں کو۔“ لیٹی نے پوچھا۔
”جی ایگزیما ہے۔“

ان جانے بھائی

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر یہ سن کر پرے ہٹ گئے جیسے وہ کوڑھی ہو۔
شاہوال کا شیشن ویر ان تھا۔ صرف چند ایک مسافر تھے۔ وہ جلدی سے اتر اور پچکے
سے شیشن سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک ویر ان راستہ اختیار کیا تاکہ کوئی دیکھنے لے
پکھری پہنچ کرو۔ محض بیٹھ کے کمرے کے باہر چند دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ
گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں اس کا کوئی جانا پہچانا نہ تھا۔ پھر وہ
آواز کا انتظار کرنے لگا۔ وہ پہر ہو گئی لیکن اسے آوازنہ پڑی۔

ایک پولیس والا دور کھڑا سے گھور رہا تھا۔ ایلی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی جو اس
کے پاس بیٹھے تھے سب جا چکے تھے۔ دروازے کے سامنے وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا
گیا تو اس نے گھبراہٹ محسوس کی۔ ضرور کوئی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر پکھری
کے پیادے سے ملا۔

”شہزادہ بنام الیاس کی باری کب آئے گی۔“ اس نے پوچھا۔
”تم کون ہو۔“ وہ بولا۔

”میں الیاس ہوں۔“

پیادے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”اپنی باری پر
حاضر نہیں ہوتے اور پوچھتے ہیں۔“

”لیکن مجھے تو آوازیں پڑی۔“

”تمہارے تو وارث بھی نکل چکے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیوں بھی۔ کیا بات ہے۔“ وہی پولیس والا آگیا۔ ”کون ہوتا؟“ اس نے ایلی سے پوچھا۔

ایسا صفت دیکھنے کے جواب دیا۔

”صاحب ذر الدہرا ہے۔“ پولیس والا چلایا۔

ایک انکشیر نے جانے کہاں سے آگیا۔

”دہرا آؤ۔“ انکشیر نے ایلی کو گھور کر دیکھا۔ دہرا آؤ ہمارے ساتھ۔

وہ اسے ساتھ والے گھر میں لے گئے۔ وہاں پولیس افسر کری پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے زیریں کچھ با تمیں دہرا میں پھر وہ افسر کہنے لگا: اسے حالات میں ہندکر

- ۹۹ -

”کس لئے؟“ ایلی نے بعد مشکل کہا۔

”وجہ بعد میں بتائیں گے۔“ انکشیر نے کہا۔

”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ انکشیر بولا۔

کری پر بیٹھے ہوئے افسر نے ایلی کی طرف دیکھا اور بولا: ”تمہارے وارث ہیں۔ یا تو ابھی پانچ ہزار کی ضمانت کراؤ ورنہ حالات جاؤ۔“

”کہاں ہے تمہارا خان۔“ انکشیر نے پوچھا۔

ایلی نے بے بسی سے چاروں برف دیکھا۔

وہ اسے لے جانے لگا تو پولیس کا ایک اور اسے ایس آئی داخل ہوا۔ ”السلام علیکم۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اصفی صاحب۔ آپ یہاں کہاں؟“ ایلی نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے قطعانہ جانتا تھا۔

”اے لے جاؤ۔“ کری پر بیٹھے ہوئے افر نے کہا۔
سپاہی نے ایلی کالباز و پکڑ لیا۔

”لیکن۔“ نووار داے ایس آئی نے کہا۔ ”میں جوان کا خاص ہوں۔“
انہوں نے حیرت سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔
ایلی خود حیران کھڑا تھا۔

”آپ اس معاملے میں ن آئیں مجید صاحب۔“ افر نے اے ایس آئی سے کہا۔
اے ایس آئی نے اپنی بیٹھی ہوئی اور افسر کے سامنے میز پر بکھڑی۔ ”یہ لیجھے اپنی نو
کری۔“ وہ نہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ ”اب تو میری ضمانت منظور کیجئے گانا۔“
ایلی بے بناء کھڑا تھا۔ وہ مجید کی طرف دیکھ رہا تھا۔
اتھے میں ایک خوش شکل آدمی داخل ہوا۔ وہ سب منود بانہ انداز سے کھڑے ہو
گئے۔

”آخا۔“ نووار چلایا۔ الیاس صاحب ہیں۔ آئیے الیاس صاحب مجھے آپ
سے کچھ کہنا ہے۔“ اس نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کمرے سے نگل گیا۔ باہر جا کر اس
نے ایک تانگے کو اشارہ کیا۔ ایلی کوتانگے میں بٹھا کر وہ خود بھی سوار ہو گیا اور تانگہ
چل پڑا۔ کچھ دو رجا کرتا نگہ رکا۔ ایک بر قعہ پوش عورت بیٹھ پڑی تھی۔ خوش پوش
شخص نے اشارہ کیا۔ وہ عورت آ کر ایلی کے پاس بیٹھ گئی اور تانگہ پھر سے روانہ ہو
گیا۔

اس روز عجیب واقعات ہو رہے تھے۔ وہ مجید کون تھا؟ وہ اس کی ضمانت کیوں
دے رہا تھا؟ وہ خوش پوش شخص اسے کیوں لے آیا تھا؟ کہاں لے جا رہا تھا؟ اور وہ
بر قعہ پوش کون تھی؟“

آٹا اور گھن

جب وہ تانگہ شہزاد کے مکان کے پاس رکا تو ایلی چونکا۔ ارے وہ تو شہزاد بر قعہ

پہنے اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اور وہ خوش پوش خوبصورت جوان ضرور اس کا پڑوئی پولیس والا انسپکٹر تھا۔ وہ ایلی کو اپنے گھر میں لے گیا۔ شہزادے نے بر قعہ اتنا دیا۔ اس کے چہرے سے نفرت اور غصہ ٹپک رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کو ہوں پر رکھ لئے اور اسی طرح ایلی کے رہ بروتن کر کھڑی ہو گئی جس طرح اس روز کھڑی تھی جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

انسپکٹر نصیب نے مسکرا کر شہزادے کی طرف دیکھا۔ اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”دیکھنے الیاں صاحب“ وہ بولا۔ ”بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں ورنہ اس کے ننانجھ آپ کے حق میں بے حد فقصان وہ ثابت ہوں گے۔“

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”آپ کو علم ہونا چاہئے۔“ نصیب بولا۔ ”کہ شاہوال کے لوگ اور حاکم سب آپ کے اس فعل پر لعنت بھیج رہے ہیں اور مجھ سیف علی قلی خاں تو اعلان کر دیا ہے کہ آپ کو اندر کر دے گا۔“ نصیب خاموش ہو گیا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”آپ کے ڈائریکٹر کو تمام تفصیلات معلوم ہیں اور آپ نوکری سے بر طرف ہونے والے ہیں۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

”آپ کا ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکال کر یوں بے یار و مددگار چھوڑ جانا ایک فتح فعل ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”بے یار و مددگار تو میں ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

نصیب مسکرا یا: ”جو لوگ ایسے فعل سرزد کرتے ہیں ان کے عزیز اور دوست بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں بلا رورعایت آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ

ان کے ساتھ بھجوٹہ کر لیں۔“

”میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر آپ انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”یہ طلاق کا مطالبہ چھوڑ دیں۔ لڑکی اپنے گھر جائے تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔“

”ایلی نے جواب دیا۔“

”تمہیں لڑکی کو طلاق دینی پڑے کی۔“ شہزاد فرمائی۔ ”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میری بچی کا ایک بدمعاش کے ہاتھ پنچ دیا ہے۔“

انسپکٹر نے پھر اشارہ کیا۔ آپ فی الحال نبیویں۔“ اس نے شہزاد سے کہا۔

”یہ الزام ہیں۔“ ایلی بولا۔

”چلو الزام ہی سہی۔“ نصیب نے کہا۔ ”لیکن واقعات کا رخ ایسا ہے کہ آپ پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ قانون آپ کے حق میں نہیں۔“

”نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کو سزا ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔

”ہو جائے۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ ایلی بولا۔

”وہ تو ڈھیٹ ہے۔“ شہزاد چلائی۔

”آپ خاموش رہئے۔“ نصیب نے کہا۔

”آپ سوچ لیں الیاس صاحب۔“

”میں نے سوچ لیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”دیکھئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

شہزادے نفرت سے اونہہ کہا۔

”آپ کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔“ نصیب بولا۔

دفعتاً ایلی کو نہ جانے کیا ہوا کہ ماحقہ گھر سے اڑکیوں آوازیں سن کر یا شاید شہزادی نفرت بھری ”اونہہ۔“ سن کروہ بالکل نذر ہو گیا۔

”ویکھنے اسکا صاحب مجھے معلوم ہے کہ محشریٹ اور پولیس کے افران لوگوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر قدم آپ کے مشورے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے کہ ڈائریکٹر کوشکایات پیغام رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔ میں یہ سب پچھ جاتا ہوں۔ لیکن آپ کا علم میں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کیا جو ایک باعزت خاوند کے شایان شان ہے۔“

”باعزت خاوند۔“ شہزادی چلائی۔

”میں حق بجانب ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ان لوگوں کے خلاف غصہ نہیں۔ میں ہمیشہ انہیں خرچ دوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ جب تک یہ لوگ باعزت لوگوں کی طرح نکاح کا احترام نہیں کریں گے۔ آج اگر اڑخی اپنے خاوند کے پاس چلی جائے تو کل میں از خود اپنے گھر آ جاؤں گا۔“

”ہوں۔“ نصیب سوچ میں پڑ کیا۔

”اور رسولی قید اور ملازمت سے بر طرفی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ ایلی نے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

”الیاس صاحب۔ الیاس صاحب۔“ نصیب نے آوازیں دیں لیکن وہ نصیب کے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

امدر شہزادی تھی: ”اس کے مزاج ٹھیک نہ کئے تو میرا نام بھی شہزادی نہیں۔ میں دیکھوں گی کیسے نہیں دیتا طلاق!“

باہر محلے میں لوگ لگریوں میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں نے ہوتوں

پرانگیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پچھے اس کامنہ چڑھار ہے تھے۔ راہ گیرا سے رک کر دیکھتے تھے۔ لیکن اسے اس وقت کسی کا درد نہ تھا۔ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سینہ تانے چل رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اسے ہاتھوں پر کوڑ چل گیا ہے۔

محلے سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ سامنے سکول کے باہر ناظم ہٹرا ہے۔

”اُرے تم۔“ ایلی چلا یا۔ ”تم کہاں۔“

ناظم کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ انکھوں کا فرق بے حد نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ میں ہاکی سٹک اٹھائی ہوئی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر اس نے چاراً یک گالیاں دیں۔

All rights reserved
© 2002 by the author
Digitized by srujanika@gmail.com

”تم اکیلے نہیں ہو۔“ وہ چلا یا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں دیکھوں گا یہ کیا کرتے ہیں۔ ان کی ایسی کی تیسی۔ اس نے ہاکی سٹک جھلاتے کہا۔ اور پھر گالی دے کر بولا: ”انہوں نے تمہیں اکیلا سمجھا ہے کیا۔ میں جان دے دوں گا جو میرے یار کو کسی نے انگلی سے چھووا بھی تو۔ پولیس افسر ہیں تو پڑے ہوں۔ ہم بھی غنڈے ہیں۔“ اس کے منہ سے جھوک کے فوارے چل رہے تھے۔

”میں صحیح سے تمہارے ساتھ ہوں۔“ ناظم بولا۔ ”جب تم گاڑی سے اترے تھے۔ پھر جب تم گھوم کر پانے قلعے کے راستے کچھری گئے تھے اور پھر علی قلی کی عدالت کے باہر زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن یا۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ مجید کون تھا۔ اس نے تو حد کر دی۔“

ناظم قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”وہ میرا یا رہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا ورنہ انہوں نے تمہیں اندر کرنے کی سکیم مکمل کر رکھی تھی۔“

ایلی نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

”دیکھتے کیا ہو۔“ وہ بولا۔ ”ہم امر تسریعی یا رہوتے ہیں۔ ریاض، کپورا اور سراب کی طرح چوتیہ نہیں ہوتے بودے ڈر گئے۔ پیچھے ہٹ گئے۔“ اس نے غصے میں

سٹک گھمائی۔

”مجھے بھی مشورہ دیتے تھے کہ آگے نہ بڑھنا ورنہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔ میں گھن ہوں گھن۔“ وہ کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ ”مجھے پسینے والا آئے تو میرے سامنے۔“ سٹک پر کھڑا دیوانہ اور چلا رہا تھا۔ اور لوگ رک کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے سکول کے طلباء بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ اسامدہ کروں سے جھانک رہے تھے۔

سراب کا چہرہ جمٹ رہا تھا دو بھوری آنکھیں ابھر رہی تھیں پپور سر جھکائے کھجرا رہا تھا۔ ریاض خاموش لڑانے جانے کیا سوچ رہا تھا۔

ایو۔ ایو

قاضی پپر پیغام کرایلی ایک بار پھر بے چارگی اور بے چارگی اور بے بھی کھو گیا۔ وہ ویران مکان، ٹوٹا ہوا تخت وہی ویران سکول جہاں لوگ اسے درخواست گذاشتے تھے اور اسامدہ فترت سے اس کی طرف دیکھتے تھے۔ وہی غربت جو اس روز سے اس کی سر پر یوں سوار تھی جیسے جزیرے کا بڈھا۔

ایک بار اس کے بعد اسے تارتخ پر شاہوال جانا پڑا۔ لیکن اب ہر بار ناظم اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ اور ناظم کے دوست اے الیں آئی کی امداد سے حاصل تھی۔

علی قلی خاں مجسٹریٹ نے اسے عدالت میں اعلانیہ ڈانٹا لیکن اس کے خلاف کچھ نہ کرسکا اور تمام مقدمات عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو گئے چونکہ شہزاد اپنی بچپوں کو لے کر لا ہو رہی تھی۔ اس کی والدہ نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہوال چھوڑ کر لا ہو رہا جائے۔ اس کے جانے کے بعد اس کی حماقی افسروں نے ایلی کی مخالفت چھوڑ دی تھی۔

پھر ایلی کو معلوم ہوا کہ شہزاد محمود سے مل کر نفیسہ کی طلاق کر لی ہے۔ اس پر ایلی کو بالکل تعجب نہ ہوا۔ چونکہ محمود نے بارہا اسے خط لکھے تھے جب میں اسے مشورہ دیا تھا

کوہ اس کی خاطر جھگڑا نہ بڑھائے۔ چونکہ ان حالات میں اسے نفیسہ کو طلاق دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا چونکہ وہ نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے اونچے گھر میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ نفیسہ کا نکاح شیر علی سے ہو گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو گیا یہ سب فساد شیر علی کا مچایا ہوا تھا اور اس کے اپنے بھائی نے شہر اور کوہ اس بات پر ابھارا تھا۔ ایلی کو یہ خبر سن کر اس قدر تکلیف ہوئی کہ اس کا دل زندگی سے بالکل اچاٹ ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وتن تنہا شخص ہے۔ ایک سوکھا ہوا درخت جو صحراء میں اگا ہوا ہے۔ اور اردو گرد چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ ریت اور ریت اور ریت اور ریت۔

لیکن کبھی کبھار اس دیانت سے آواز آتی۔ ”ابوالاوبو“ اور ایلی دونوں ہاتھاٹا کر اس کی طرف حرث بھری تھا ہون سے لیکھتا۔

ایلی کا جی چاہتا کہ چور چوری شہزاد کے گھر جائے اور کسی سے ملے بغیر، کسی کے جانے بغیر عالی سے ملے اور اسے کہے:

”عالی! تم تو جانتے ہو۔ تم تو گواہ ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ انہوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے جبھی تم مجھے بلاستے ہو۔ ابوالاوبو پکارتے ہو۔ کوئی میرا نام نہیں لیتا۔ صرف تم ہو عالی۔“

آخری بار

دواں ایک مرتبہ وہ چوری چوری لا ہو رگیا بھی تھا۔

شام کے جھپٹیے میں وہ اس مکان کے باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ اور جب ایک نگاگول مٹول سا بچہ باہر لکا تھا تو ایلی نے دوڑ کر ایک بڑا الفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لفافے کو دیکھ کر عالی سہم گیا تھا لیکن مٹھائی اور پھل دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہرائی تھی اور پھر ایلی اس سے بات کئے بغیر وہاں سے بھاگ لیا تھا۔

ایک مرتبہ جب ایلی ایک بڑا الفافہ اٹھائے وہاں کھڑا تھا تو شہزاد عالی کو اٹھائے

ہونکی اور کھانستی ہوئی سامنے آ کھڑی ہوئی _____ وہ شہزاد کو دیکھ کر گھبرا گیا۔
”لے لو عالی۔“ وہ بچے سے کہہ رہی تھی۔ ”اپنے ابو سے لفافہ لے لو۔“ عالی حیرانی
سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایمی نے لفافہ بڑھا دیا اور چلنے لگا۔
”آؤ۔“ وہ بولی ”چائے کا پیالہ پی لو۔“
”ایمی جوں کا توں کھڑا رہا۔“
”آ جاؤ اب کیا ہے۔“ وہ کھانتے ہوئے بصد مشکل بولی۔ ”اب تو کھیل ہی ختم ہو
گیا۔“
ایمی چپ چاپ اس کے پیچے چل پڑا۔
شہزاد کو دیکھ کر شہزاد کے کندھے پر سر رکھ دیا
اور اس کی چینیں نکل گئیں۔ شہزاد اسے تحکمتے لگی۔

ایمی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں گویا کسی مرد کا پیغام تھا۔ ہڈیاں نکل آئی
تھیں۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور گوشت گویا تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کھانستی
تھی۔

”اب کیا رونا ہے۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“ وہ چلایا۔

”اب کہانی ختم ہو گئی۔“ وہ بولی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“ ایمی نے پوچھا۔

”ٹیلبی ہے۔“ شہزاد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”دوائی پیتی ہو۔“

”دوائی۔“ وہ بھی۔ ”اب تو صرف چند روز اور ہیں۔“

ایمی کے دل پر ایک چھری سے چل گئی۔

”لڑکیاں کہاں ہیں؟“ اس نے بات بدلتی۔

”اُدھر گئی ہیں نفیسہ کی طرف۔“ وہ کھانتے ہوئے بولی۔

”اور تم اکیلی ہو۔“

اس نے ہٹنے کی کوشش کی۔ ”وہ ہوں بھی یہ بیان تو اکیلی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔

”اب اکیلے پین کے سوا کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اب تو

”شہزاد،“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ وہ کھانے لگی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں؟“

”چھوڑواب۔“ وہ بولی۔ ”جو ہونا تھا ہو گیا۔“

”بڑا ظلم ہوا۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔ ہو گیا بس۔“

”چلو میں تمہیں دو را ہے لے چلوں۔“ ایلی نے کہا۔

”بے کار ہے۔“ وہ بولی اور کھانے لگی۔

”کیوں۔“

”کیا فائدہ۔“

”شاید تم صحت مند ہو جاؤ۔“

”اب کیا فائدہ۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔ صحت اچھی ہو جائے تو۔“

”تو کیا ہو گا۔“ اسے پھر کھانی چھڑ گئی۔

ایلی اس کی بات سن کر کانپ گیا۔

”کیا حرج ہے۔“ وہ بولا۔ ”چلو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”اب میں نہیں جاتی۔“

”ضد کرتی ہونا۔“ وہ بولا۔

”چھوڑوا ب ان باتوں کو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”صرف ایک ہی بات ہے میرے پاس تھی۔“
”کیا؟“

”کہ آج بھی تم میرے لئے وہی شہر اور جو پہلے تھی۔ وہی بیزٹھڑی۔“

”سچ۔“ اس نے ایلی کہا تھا قہام لیا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”میرا خیال تھا۔“ وہ کہنے لگی لیکن اسے کہانی پھر گئی۔

”کیا خیال تھا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کہ تم بدلتے ہو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں بدلتا۔

”سچ۔“ اس نے ایلی کہا تھا بایا۔ ”پھر مجھ سے اس قدر ضد کیوں کی۔“

”وہ اور بات تھی۔“ وہ بولا۔ ”میرے دل نے اس بات کو گوارانہ کیا لیکن میرے دل میں تمہارے لئے کبھی غصہ یا نفرت پیدا نہیں ہوتی۔“

”سچ۔“ اس نے پوچھا۔

”تم بدلتے ہوئے نظر آتی تھی۔“ وہ بولا۔

”چلو چھوڑوا اس بات کو۔“ وہ بولی اور کھانے لگی۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

”کیا کرتی ہوا جکل۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا کرنا ہے۔ پڑی رہتی ہوں۔“

”سارا دن۔“

”ہاں۔ ڈاکٹر نے اٹھنے بیٹھنے سے منع کر رکھا ہے۔“
”پھر تم باہر کیوں آئی تھی۔“

”جی چاہتا تھا آخری بار ملوں۔“

”کیا واقعی۔“ اس نے پوچھا۔
”ہاں“ وہ نہیں ”وہ عالم میں مانگتی تھی کہ ایک بار تم آور۔“

”میں تو آتا ہی رہتا تھا۔“

”مجھے پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ کہانے لگی۔“

”ہوں۔“

”پھر جب عالی نقاومت اور پتہ چلتا پر تم جا چکے ہوتے۔“

”اور اب کی بار۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پتہ نہیں،“ وہ بولی۔ ”سوی ہوئی تھی۔“

”پھر؟“

”پھر ایسے ہوا جیسے کسی نے مجھے جنجنحوڑا۔“

”کس نے؟“

”پتہ نہیں کسی نے میرے کان میں کھا۔ مل لو۔“

”ہوں۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”میں نے عالی کواٹھا لیا اور باہر نکل آئی۔“

”تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔“

”نہیں جاتا۔“ وہ بولی ”پر تم سے ملنا تھا اس لئے۔“

ایلی نے اس کے دو نوں ہاتھ اپنے گال پر رکھ لئے۔ وہ دری تک خاموش بیٹھے رہے۔

”تو تم مجھے بھولی نہیں سکتے۔“ ایلی نے کہا۔

”تمہیں،“ وہ بولی۔

”آن دونوں تو بہت غصہ تھا۔“

”تھا۔ لیکن یہ بھلانے مجھے بھولنے دیتا ہے۔“

”کون؟“

”یہ عالی۔“ کھانے ہوئے بولی۔

”عالی؟“

”ہا۔ سارا اون بیٹھا بولا لو کرتا رہتا ہے۔“

”مجھے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ بولا۔

پھر کھانے لگی اور پھر خون چھوکا۔

ساری رات دونوں بیٹھے با تین کرتے رہے۔ صبح کے قریب ایلی کی آنکھ لگ گئی۔

جب وہ بیدار ہوا تو سات بجے تھے۔

”شہزادے۔“ وہ بولا۔

”جاگ پڑے۔“ شہزادے بھی سے مسکرائی۔

”تم نہیں سوئیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”اب تو دریہ ہو گئی۔“

”یعنی۔“ اس نے پوچھا۔

”دریے سے سونا چھوٹ گیا۔“ وہ کھانے لگی۔

”کیوں؟“

”نیند نہیں آتی۔“

”ساری رات بیٹھی رہتی ہو۔“

”ہا۔“

”وقت نہیں گزرتا۔“

”باتیں یاد آتی ہیں۔“

”کوئی؟“

”ایک ایک۔“ اسے پھر کھانی کا دروازہ پڑا گیا۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”میں آ جاؤں گا۔“

”کہاں۔“ اس نے پوچھا۔

”تمہارے پاس۔“

”جع۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”جع چھٹی لے آؤں ایک مہینے کی۔“

”ایک مہینے کی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ اکٹھے رہیں گے۔“

”اچھا۔“ اس نے ایلی کا ہاتھ دبایا۔ کب تک مل جائے گی؟“

”ہفتے کے اندر۔“

”ہفتہ۔“ اس نے بر اسمانہ بنایا۔ اسے پھر کھانی چھڑگئی۔

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ہفتہ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”جلدی۔“

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ اب جاتا ہوں۔“

”اچھا۔“ شہزاد نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”اگر جانے سے پہلے کوٹھے پر چھوڑ آؤ۔“

”کیا مطلب۔“ ایلی نے کہا۔

”میں بیٹھیاں نہیں چڑھ سکتی۔ وہوپ میں پڑی رہوں تو آرام رہتا ہے۔“

”اٹھا کر لے چلوں۔“

”ہاں۔“ وہ بولی اور کھانے لگی۔

ایلی نے اسے دونوں بازوؤں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ یوں اس کی چھاتی سے چمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہو۔

”آؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”تو روز تمہیں کوئی بٹھے پر لے جایا کروں گا۔“

”ہاں۔ دھوپ میں مجھے آرام رہتا ہے۔“ وہ بولا۔

”اک بٹھے دھوپ میں بیجھا کریں گے۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”پر جلدی آنا۔“

ایلی اسے چار پیالی پر لٹانے لگا تو شہزاد کاسر پنگ کے پائے سے ٹکرا آیا۔

”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں چھوٹ آئی ہے۔“

”اچھا ہوا۔“ وہ بولا۔

ظاہر تھا کہ شہزاد کو چھوٹ لگی ہے۔

”مجھ سے غلطی ہوئی۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا ہوا۔“ وہ بولا۔ ”تمہارے ہاتھوں چھوٹ آئی ہی تھی مجھے۔“

”کیوں۔“

”بس۔ اچھا ہی ہوا۔“ وہ کھانے لگی۔

وہ دریتک اس کاسر ہاتھوں سے ملتا رہا اور پیار سے اسے دباتا رہا۔ وہ بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”اچھا میں اب جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

شہزاد نے چپ چاپ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاضی پور پہنچ کر وہ سید حاصل کوں پہنچا۔

وہندہ کا

اس روز اس نے محسوس کیا کہ قاضی پور کے سکول کی عمارت بہت بڑی اور خوبصورت تھی اور ماحقة پارک بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور گراؤنڈ میں سفیدے

کے درخت بہت خوبصورت لگتے تھے۔

سکول میں آدھی چھٹی ہو چکی تھی۔ اساتذہ حسب معمولی بغیر میں بیٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ وہ اساتذہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”آئیے آئیے الیاس صاحب“ ایک صاحب نے گرجوٹی سے اس کا استقبال کیا۔

”آپ تو الگ تھاگ رہتے ہیں۔“ دوسرا صاحب بولے۔
”کبھی صورت ہی نہیں کھائی۔“ تیسرا صاحب بولے۔
آپ جیسی صورت ہو تو مجھے بھی دکھانے میں کوئی چکچا ہٹ نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

انہوں نے جیرے سے ان کی طرف دیکھا اور منکرا نہ لے۔

”وہ صاحب۔“ ایک صاحب کہنے لگے۔ آپ تو بولنے لگے۔“

”میرا قصور نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ موسم ہی ایسا ہے۔“

”تو آپ دیدر کا ک ہیں۔“ دوسرا صاحب نے کہا۔

اس پر ایک تھقہہ پڑا۔

اس روز دیر تک وہ اساتذہ سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور چھٹی کی درخواست پیش کر دی۔

”دیکھنے الیاس صاحب۔“ انصاری بولے۔“ میں ایک ماہ کی چھٹی تو منظور نہیں کر سکتا۔ ہاں سفارش کر کے لا ہو رجھوار دیتا ہوں۔ منظور ہو جائے تو آپ شوق سے چھٹی پر چلے جائیے۔“

”کب تک منظور ہو جائے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”ایک ہفتہ لگے لگا۔“ وہ بولے۔ ”کم از کم“

”بہت خوب۔“

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے چند ایک چیزیں خرید کر گھر میں رکھنی

چاہیں۔ یہ خواہش ایلی نے اس شدت سے محسوس کی کہ وہ اسی وقت بازار چلا گیا تا کہ پتہ لگائے کہ آیا اسے چند ایک چیزیں کرایہ میں سکتی ہیں۔ دیر تک وہ بڑے بازار میں گھومتا رہا۔

”کیا فرنچیپ کرایہ پر دیتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔“ لڑکے کے والد نے کہا۔ ”آپ فرمائیے آپ کو کیا چاہئے۔“

رات کو دیر تک مکان میں فرنچیپ کی چند چیزیں سجا تارہا اور پھر سو گیا۔ اس روز گویا ایلی کے بدے ہوئے روپیہاں دیکھ کر بھی حیران تھے۔
جماعت میں وقت کا شے کی بجائے اس نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نویں جماعت کے لڑکے تو اس کے دو ایک سبق سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

اساتذہ بھی اب اس میں دلچسپی لینے لگے حتیٰ انصاری صاحب نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔ انہوں نے ایلی کو بلا کراں سے بات بھی کی تھی۔ بولے:
”ایسا صاحب۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی لمبی چھٹی کو ملتوی کر دیں۔“
ایلی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

”دیکھئے نا۔“ انصاری بولے۔ ”امتحانات بالکل قریب ہیں۔ اگر آپ چھٹی پر چلے گئے تو نتیجہ پر برادر پڑے گا۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن مجبوری ہے۔“

”آخر آپ کس کے لئے چھٹی لے رہے ہیں۔“

”جی میری بیوی بیکار ہے۔“

”آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے۔“ انصاری نے کہا۔

”جی وہ بہت بیکار ہے۔“

”اگر میں موڑ کا انظام کر دوں تو۔“

”شاید۔“ ایلی نے کہا۔ ”شاید یہ ممکن ہو۔“

”آپ کوشش کریں گے۔“

”جی۔“ وہ بولا۔ ”کروں گا۔ اگر ممکن ہو تو۔“

ابھی وہ ہیڈ ماسٹر سے بات کر رہا تھا کہ ڈاکیہ آ گیا۔ اس نے ایک لفافہ سا اٹھایا ہوا تھا۔

”جی۔“ وہ بولا۔ ”ایس آ صفائی۔“

ایس نے وہ خط باتھیں تھام لیا اور بد متور ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتمیں کرتا رہا۔ ”انصاری صاحب میرے حالات میرے لیکن میں نہیں۔ کچھ ایسی الجھنیں ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔ لیکن _____“

”ارے بھائی۔“ انصاری بولے۔ ”اس تار کو پڑھ لو پہلے۔“

”تار۔“ ایلی نے ہاتھ کے لفافے کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے تار کھولا۔

”کیوں۔ خیریت تو ہے؟“ ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی چونکا _____ وہ پھر کھو چکا تھا۔ اس نے تار ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ تھماوی لکھا تھا:

”شہر اول رات کوفوت ہو گئی۔ جنازہ صح نوبجے ہو گا۔“

سامنے گھری گیارہ بجارتی تھی۔

گردو پیش پر دھند لکا چھا چکا تھا۔

انصاری کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

با غیب میں ایک بڑے سے بلنگ پر ایک لاش پڑی تھی۔

پاس ہی ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھائے چلا رہا تھا۔ ”ابو۔ ابو۔“ پھر وہ بھاگ رہا تھا۔

بھاگے چلا جا رہا تھا۔

”اب کیا ہے۔ اب کیا ہے۔“ لاش منہ سے چادر اٹھا کر کہہ رہی تھیر است کی رکاوٹ۔ ریل ہونک رہی تھی۔ انجن چینیں مار مار کر رورہا تھا۔

تالگے والے چلا رہے تھے۔ پھر بہت سے لوگ دروازے اور کھڑکیوں میں کھڑے اسے گھور رہے تھے۔

”وہ آگیا۔ وہ آگیا۔“

”ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔“

”اب آیا تو کیا آیا۔“

یہ ہو کے رہے کا۔ ”حابی صاحب نکرا رہے تھے۔“

”تم آگئے۔“ شہزاد اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ابو۔ ابو۔“ دونخے منے با تھا اس کی طرف بڑھے۔

ایمی نے ایک بچے کو سینے سے چمنا لیا۔

پروہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک بڑی سی قبر سامنے آگئی۔ اس پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔

وہ قبر پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ سارا قبرستان اس کی اوٹ میں آگیا۔

پھر وہ ابھر نے لگی۔ ابھرتی گئی زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔

”تم آگئے۔“ ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

پھر ایک سیلا ب امنڈ آیا۔ پانی ہی پانی۔ وہ قبر اس پانی میں بہ گئی پھر وہ بچوں

۔ پھر وہ بچوں کی طرح بلبلہ کی چینیں مار رہا تھا۔ اس سیلا ب میں ڈوب رہا تھا۔

وھتا اس کی نگاہ بچے پر پڑی جواس کے سینے سے چمنا ہوا تھا۔ ”ابو۔ ابو۔“

وہ اٹھ بیٹھا جیسے وھتا اسے سہارا مل گیا ہو۔ جیسے زندگی میں پھر مفہوم پیدا ہو گیا ہو۔

”عالیٰ عالی“ اے کوئی جنجنھوڑ رہا تھا۔

اے عالیٰ کواس سیلاب سے بچانا تھا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

”ابو۔ ابو۔“ ریل گاڑی جیخ رہی تھی۔ ”ابو۔ ابو۔“

سامنے شہر اور کھڑی مسکن رہی تھی۔



پاکستان

مہینے کی چھٹی گزارنے کے بعد گویا اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک نیا آدمی ابھر آیا تھا۔ ایک ایسا آدمی جسے اپنے ماضی سے نہ لگ تھا نہ لگا و جو اپنی گزشتہ زندگی پر نہ تو شرم محسوس کرتا تھا اور نہ پیتے ہوئے واقعات کو ذہن میں دہرانے کا شوق رکھتا تھا، اسے اپنے گزشتہ افعال پر پیشمانی نہ تھی نہ ہی وہ اس پر فخر کرتا تھا۔ جو بیت چکا تھا۔ وہ اپنے گزشتہ عشق کی حماقت نہیں سمجھتا تھا۔ اسے اب بھی عشق کی عظمت کا اعتراض تھا۔ وہ حماقتوں کی اہمیت کا عرف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان حماقتوں نے اس کی زندگی میں رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ حماقتوں قلمی تھیں انسانیت بخش تھیں۔ وہ انہیں دہرانے کا بھی شوقیں نہ تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے مستقبل پر تاریک سایہ نہیں دال رہی تھیں۔

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کے پوڑے اور پھنسیوں نے اس کی طبیعت شخصیت کردار خیالات، محسوسات پر کوئی داع نہ چھوڑا تھا۔ اس حسن اتفاق کا شدت سے احساس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی سے عشق لگا کر بیٹھ جاتا اور شریف کی طرح باقی زندگی آہیں بھرنے اور چھپت کی طرف حرست بھری لگا ہوں سے دیکھنے میں بس کر دیتا۔ یا اپنی گزشتہ زندگی کو قابل فریں قرار دے کر من نہ کردم شاحد رجمنید کا پر چارک بن جاتا۔

اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ زاویہ نگاہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں اس لیے اس نے اترزاں کچھ بھی تو نہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ گزشتہ زندگی سے اخذ کیے گئے لگاں یا لگاؤ سے بچ رہنا ایک بہت بڑی نعمت ہے لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ نعمت کس کی دین ہے۔

محسوسات کے لحاظ سے وہ ابھی تک بچ رہا۔ ڈنی طور پر اس کی پیچگی اور بڑھ گئی تھی۔ جذباتی پہلو کے لحاظ سے زندگی نے اسے کچھ نہ سکھایا تھا۔ ڈنی لحاظ سے ہر

تجربہ ہر مشاہدہ اس کے فکر میں ایک نئی کلی بن کر رہ جاتا تھا۔ اور اس کی شخصیت پر اثر ارادہ از ہوتا تھا۔

زندگی کے دریا کے بہاؤ کی منجد حارگز رچکی تھی۔ اب وہ پایا ب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایا ب پانی میں پہنچ کر ایساں ہصفی نے دفعتاً محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد اپنی اناگی بندشوں سے آزاد اس کی آنکھوں سے ذاتیات کے چشمے اتر گئے تھے۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

دنیا بے حد و سبق تھی۔ مگر وہ بہائی وسعت اور اسی پیدائشیں کر رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کو دیکھا۔ اس کے روپ و سینکڑوں ایلی تھے جو جذبات کے گخواریں ذیکر کیا گھاڑے تھے۔ وہ انہیں قابل نفرین نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اسے ان سے ہمدردی تھی اس کے دل میں ان کی عزت تھی۔

ایلی میلے سے واپس آ رہا تھا۔ لیکن جو میلے کو جارہے تھے ان پر ختمہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ ہر پور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری ہے۔ اور بے لگ لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری ہے۔

اس کے خیال میں محبت ایک عظیم تجربہ تھا۔ اور اس عظیم تجربے کے چار ضروری دور تھے۔ پہلا یہ کہ شدت سے محبت کرے وہرے اسے محبت میں عظیم کامیابی حاصل ہو یعنی تجھ پر بیٹھے اور مورچھل کرائے۔ تیرے یہ کہ محبوب اس کی تذلیل کرے اور دھکادے کرتخت سے نیچے پھینک دے ذلت اور رسولی چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور چو تھا یہ کہ وہ عشق کامیابی تذلیل اور رسولی سب سے بے نیاز ہو جائے۔ بے لگ بے لگاؤ۔

اس کا یہ نظریہ جسمانی عشق کے متعلق تھا۔ افلاطونی یا روحانی عشق کے تخلیل سے وہ واقف ہی نہ تھا۔ افلاطونی عشق تو محض ایک قصہ تھا۔ البتہ روحانی عشق کے وجود سے

وہ منکر نہ تھا۔ لیکن اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ روحانی عشق کا مطلب کیا ہے۔ ایک انسان کس طرح اللہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ مرشد کا نام سناتھا۔ لیکن بیعت اور مرشد کے متعلق ابھی تک اس کے وہی خیالات تھے جن کا کسی زمانے میں ولی کی جامع مسجد میں اس نے حاجی صاحب کے روپرواقہ میں اظہار کیا تھا۔

گروپتن

قاضی پور سے ایلی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گروپتن میں مقیم تھا۔ گروپتن ایک چھوٹا سا خوبصورت ساتھیہ تھا۔ اس میں دو ایک کشاورہ سڑکیں تھیں جن پر بنگلے اور کائیج بنے ہوئے تھے دو ایک تنگ و تاریک بازار لائتھے شہر کے باہر چند ایک صاف سترہی آبادیاں تھیں کچھ حصہ لٹھا گھٹا سا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گروپتن میں طرز کہن اور طرز جدید دونوں پہلو موجود تھے۔

بازاروں میں بھیر تھی سول لائنز نمائانہ تھے میں خوبصورت ویرانی تھی۔ ایلی کو ویرانی پسند تھی۔ اور اس کا مکان بھیڑ اور ویرانی بھرے علاقوں کے سکم پر تھا۔ گھر میں عالی تھا اور ایلی کی ماں ہاجرہ۔ اب ایلی اکیلانہ نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ عالی سے الگ رہنا تکلیف دہ تھا۔ پھر بھی اس کی تمام تر توجہ عالی پر مرکز تھی فالباً گزری ہوئی تلخی کو بھلانے کے لیے اس نے عالی کا سہارا لے لیا تھا۔

عالی ایک بحدا سالڑ کا تھا۔ اس کے نقوش موٹے تھے۔ چہرے پر بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ حرکات خاصی حد تک بے ربط تھیں۔ اس کے خدوخال میں قطعی طور پر شہزادی جھلک نہ تھی۔

ہاجرہ کا ایلی کے پاس رہنا گزیر تھا۔ چونکہ چار سال کے بچے کو پاس رکھنا ایلی کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ اکیلانہ تو اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اور ناسے گھر میں اکیلانہ چھوڑ کر خود نوکری کے فرائض ادا کر سکتا تھا۔

ایلی نے پھر سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ بلا واسطہ

کتاب اٹھائی تھی اس سے پہلے اس نے کئی شدت سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت محض فرار کی ہی تھی۔ تلخ واقعات کو بھولنے کے لیے اس نے کیہ بار کتاب کا سہارا لیا تھا۔ لیکن اب پہلی مرتبہ اس نے کتاب کے لیے مشہت شدت سے محسوس کی تھی۔

سارا دن یا تو وہ پڑھتا اور یا عالی سے کھیلتا رہتا اور پھر اس کا جی چاہتا کہ شام کو کسی طرف نکل جائے اور پھر کسی غلام کے پاس جائیجئے۔ اور ستاری لرزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر لیں اور وہ لان میں دو ب جائے۔

ایلی کے کردار کی شدت اگرچہ بہت کم ہو چکی تھی پھر بھی وہ سمجھاں بھرے تاثرات کا تھا ایسے تاثرات جو اس کی شخصیت کے کونوں کو تراش کر ہموار کر دیں۔ بھی کچھی تکنیکوں کو سمیٹ لیں۔ اس کے زندگیک موسیقی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ جو اسے سکون سے ہم آہنگ کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت میں لے پیدا کرے۔ پھر دننا اسے خیال آیا کیوں نہ میں طلبہ بجانا سیکھوں۔

اس نے اس سلسلے میں حقیقت کی۔ لیکن ہر جگہ سے اسے ایک ہی جواب ملا۔ سارے گروپن میں صرف ایک ہی فرد تھا جو طبلہ بجائے اور انگلینی محفل کے لیے مشہور تھا۔ اور غالباً اسی وجہ سے سب لوگ اسے رنگی کہتے تھے۔

رنگی کسی سرکاری دفتر میں اسپکٹر تھا ।! ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اسپکٹر طبلے میں وچکپی لے سکتا ہے۔ اس لیے اس نے اسپکٹر سے ملنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اسے ایک بڑے عہدے دار سے راہ ربط پیدا کرنے میں اچکچا ہٹ محسوس ہوتی تھی۔

گروپن میں جو مکان انہیں ملا اس کے پڑوس میں ایک اویز عمر کی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں وہ وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ اور بے جواباً ایلی کی طرف دیکھ کر پر اسرار طور پر مسکراتی رہتیں۔

ایلی نے پہلے تو ان سے دور رہنے کی کوشش کی۔ وہ گھر میں داخل ہوتیں تو ایلی کمرے میں لگھ جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے میں پہنچ جاتیں تو وہ باہر صحن کی طرف بھاگتا۔ اک روز جب وہ صحن کی طرف جانے لگا تو بڑی لڑکی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور بامعنی اندازے مسکرا نے گئی۔ ایلی کو اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ اب وہ ان چھمیلوں میں نہیں پڑتا چاہتا تھا۔ اسے عورت میں وہ خصوصی دلچسپی نہ ہی تھی جو کسی زمانے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ جوانی میں وہ عورت سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کی طرف بر کی طرح کھنچا جاتا تھا بڑا اور دلچسپی۔ عورت اس کے دل میں یہ دو جذبات پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت کو اس نے بے حد رہیت بخش رکھی تھی۔

پھر عورت کے متعلق اس کے خیالات تھے سے بھر گئے۔ وہ بے وفا تھی اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیاٹ تھی وہ ایک شہر اجال تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کا حرم عظیم تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عورت ایک کمزور اور بے لبس مخلوق ہے۔ اور اس کی جاذبیت میں گہرائی نہیں۔ اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ قدرت کی طرف سے وہ تغیر پر مجبور ہے۔

شاید اسی وجہ سے اسے ان دو لڑکیوں سے قطعاً دلچسپی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس نے سوچ کر وہ اس کی آزادی میں مخل جو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا مکان بدل لیا۔ اور وہ شہر کے کونے پر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

رنگی

پہلے روز ہی رات کے وقت اس کے کان کھڑے ہوئے کوئی شخص طبلہ بجارتا تھا۔ پھر کسی نے گانا شروع کر دیا۔ اسے غلام یاد آگیا۔

اگلے روز شام کے وقت ایلی نے پھر طبلہ کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل

گیا۔ قریب ہی پڑوس میں ایک بیٹھ کے طبلہ بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہو کر بیٹھ کی طرف دیکھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سوت پہننے بول گئے فرش پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ اس کا لباس خوبصورت تھا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ارشٹو کریٹ ہوں۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے میں بلا کی جاذبیت تھی اس کی شخصیت سے مٹھاں کے چھینٹے اثر رہے تھے۔

ایلی قریب چلا گیا۔

”آئیے آئیے وہ مسکرا لیا“ بیٹھے۔

”دنیں نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”اپ شغل جاری رکھیے میں نہیں سے سنوں گا۔“

”آئیے بیٹھے نا۔“ وہ بولا ”آ بھی جائیے۔“ وہ پھر مسکرا لیا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد و نواز تھی۔

”اب آ بھی جائیے۔“

ایلی اندر رواخی ہو گیا۔

دیر تک وہ طبلہ بجا تارہا۔ ایلی چپ چاپ سنتا رہا۔

پھر اس نے طبلہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور بولا ”لیجھے میں ذرا ستالوں۔ اجازت ہے ؟“

وہ یوں نہس کر باتیں کر رہا تھا جیسے عرصہ دراز سے اسے جانتا ہو۔

”آپ کو اس میں دچپی ہے کیا؟“ اس نے طبلے کی طرف اشارہ کیا۔

”سننے کا شوق ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یتو کان کا رس ہے۔“ وہ مسکرا لیا۔ ”جس کے کان میں رس ہے اس کی روح میں مٹھاں ہے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”کان میں رس نہیں لیکن روح میں مٹھاں پیدا

کرنے کی آرزو ہے۔“

”سب رنگ رس کا کھیل ہے۔“ وہ بولا۔

”آپ کی تعریف؟“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے رنگی کہتے ہیں۔“

”رنگی؟“

”ہاں طنز کہتے ہیں۔“ بے دنک ہوں نا اس لئے۔“

”بے رنگ ہیں آپ۔“ ایلی نے کہا۔ ایسا اچھا طبلہ بجا تھے ہیں۔“

”اوہ ہوں۔“ وہ بولا۔ ”زندگی صرف گردی لیکن سمجھ لجھے کھوؤی۔ بات پیدائشیں ہوئی۔“

”نہیں ہوئی۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔“ وہ بولا۔ ”رس پیدائشیں ہوا۔ صرف ڈب ڈب کرنا سیکھایا ہے۔ صرف فارم روخ نہیں شور ہے وہر کئیں نہیں۔“

ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قدر رنگیں شخصیت۔ اس کی ہر بات میں رنگ تھا رس تھا۔ انداز بیان میں، چھوٹی چھوٹی حرکات میں۔ نگاہ میں، تکلم میں، گروپن کے صحرا میں وہ پہانچ لختا نہ تھا۔

رنگی پھر سے طبلہ بجائے میں مصروف ہو چکا تھا۔ طبلہ بجا تے ہوئے اس کی بیٹھ بھی عجیب تھی چھاتی نکلی ہوئی۔ سراٹھا ہوا۔ کتنا وقار تھا اس بیٹھک میں ایلی اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

دنختا وہ مسکرا یا۔ ”تکلیف نہ ہو تو ذرا آگے سے ہٹ جائیے۔ ذرا ادھر کو۔“ انہیں تکلیف ہوتی ہے اس لیے کہتا ہوں۔ ”رنگی پھر مسکرا یا۔“

”کسے تکلیف ہوتی ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”شریعتی کو۔“ وہ مسکرا یا۔

شریعتی وہ حیران تھا۔ لیکن مزید بات پوچھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

کچھ دیر نگی اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا کر بولا۔ ”شب بخیر شب بخیر جائیے۔“ آرام فرمائیے۔ اس کاروائے خطاب ایلی کی طرف نہ تھا۔

شریعتی

”اے۔“ ایلی حیران تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے اس نے دروازے سے باہر دو ایک بار دیکھا تھا۔ لیکن باہر ٹھاؤپ آندھیرا تھا۔

”معاف کیجئے گا صاحب۔“ رنگی ایلی سے مخاطب ہوا۔ ”شریعتی آجاتی ہیں تو مجھے انہیں اٹھنڈ کرنا پڑتا ہے۔“ اکثر اتنی ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ دروازے کے سامنے ٹیکھو۔ روشنی منہ پر پڑے۔ دروازے میں کسی کو کھڑا ہونے نہ دو، ہم تو احکامات کے پاہنڈ ہیں۔“

”کون ہے وہ؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ مسکرایا۔ اپنے مہربانوں میں سے ایک ہے۔ اپنی زندگی ان مہربانوں کی نگاہ کرم کے سہارے بیت رہی ہے۔“

رنگی سے مل کر ایلی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔ رنگی میں کس قدر رجاویت تھی۔ کتنا رنگیں کردار تھا۔ ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گیا وہ رنگی کے بے حد قریب ہو بہت قریب۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ مدرسے سے آ کر ایک پیالہ چائے پیٹھ میں آندھیل کرو، وہ رنگی کے پاس جا بیٹھتا۔ رنگی کی شخصیت سے رنگ کے چھینٹے اڑتے اور بھیگ بھیگ جاتا۔

”ایلی صاحب۔“ تیرے ہی روز رنگی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ شریعتی کے چانز تباہ کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ دروازے سے ہٹ جائیے نا۔ انہیں دیکھ کر اپنا شوق پورا کرنے دیجئے۔“

ایلی نے مذکور دروازے سے دیکھا۔

دور سے ایک بڑی سی کوٹھی کی چار دیواری پر ایک رنگ دار گلھا سار کھا ہوا تھا۔
”اوہبھوں یہ فاؤں ہے۔“ رنگی بولا۔ ”اوہر اعلانیہ دیکھنا فاؤں ہے۔ ہاں اندر بیٹھ کر
چھپ کر شوق سے دیکھئے۔ میرے سارے دوست دیکھتے ہیں ملب یہ ہے کہ شریعتی
یہ سمجھیں کہ ان کے بارے میں کوئی سچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ میرے سمجھی دوست
جانتے ہیں اور شریعتی جانتی ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ اور چھپ چھپ کر اسے دیکھتے
ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں کہ اس راز کو صرف ہم دونوں جانتے ہیں
وہ خود اور میں۔ کیا پیارا دھوکا ہی۔ ساری شریعتیاں ہی پیارے دھوکے ہیں۔ جی
چاہتا ہے کہ ان پیارے دھوکوں کا ایک جنمکھنا لگا رہے۔ اور میں اس میں ڈوبا
رہوں۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وہ ایلی کی چرف دیکھے بغیر بولا۔“ میں انہیں دیکھوں آپ
مجھے دیکھیں۔“

کچھ دیر تک وہ دیکھا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ لیکن ”شریعتی چلی گئیں غالباً پتا جی
اگئے۔“

”وہ کون ہیں ان کا پتا جی؟“
رنگی نے جھر جھری لی۔ ”پتا جی وہ ہیں جو چاہیں تو مجھے تین سال کے لیے اندر کر
دیں۔“

”یعنی۔“ ایلی نے حیرت سے اپو چھا۔

”مجھٹریٹ ہیں غالباً اور روز دعائیں مانگتے ہیں کہ میں کبھی ان کے پنجے میں
چھنس جاؤں۔“

”اے۔“ وہ چلا یا۔ ”میں آپ سے با تین کرنے میں وقت گنو اور ہاں ہوں اور اوہر
ان্তظار کر رہے ہیں۔“ وہ دوڑ کر باہر لکلا اور بیٹھ کر سے باہر کھڑا ہو کر دوسری سمت

دیکھنے لگا۔

ایلی جوں کا توں پیٹا رہا۔

پچھدری کے بعد رنگی داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔

”یہ کون تھے؟“

”اپنے ایک ہبہ بان دوست ہیں۔ اپنی زندگی میں اور ہے ہی کیا۔ اسپکٹری کی بک

بک۔“ ہو ہنسنے لگا۔

”اسپکٹری؟“ ایلی نے ٹکل کی طرف دیکھا۔

”نوکری اور کیا ہے وہ بولا تو ہے۔“

”تو کیا آپ اسپکٹر ہیں؟“

”ہاں۔“ بڑی ذمیل چیز ہے یہ اسپکٹر دم گھٹتا ہے۔

تو یہ وہی اسپکٹر تھے جنہیں ملنے سے ایلی ہچکا تھا۔

”جی چاہتا ہے۔“ رنگی بولا ”کہ آج ہی استھنی دے دوں، پر گزرہ گز رکیے ہو گا۔

وال روئی سے بھی جواب مل جائے گا۔ مجبور ہوں۔“

رنگی کی شخصیت میں رنگ اور رس کے علاوہ عجیب اضداد تھے۔ طبعاً وہ ایک محظوظ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں عشق کرنے کے لیے بے پناہ ترقب تھی۔ عشق میں وہ ایک بخوار تھا جو پھول پھول بیٹھ کر رس چوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں واضح نسبت کی جھلک تھی۔ لیکن جسم مردانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عظیم مرد کی جھلک تھی۔ کروار میں بھی مردانہ رنگ تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ وہ پیدائشی ارشٹو کریٹ تھا مگر اس کے خیالات اور جذبات میں عوام سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ خود کو ہمیشہ عوام میں سمجھتا تھا۔ اور آخری بات یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بہر حال زندگی کی بے پناہ شخصیت نے ایلی کو جذب کر لیا اور وہ گھرے دوست بن گئے۔

پھر ایک روز رضی آگیا۔

رضی رنگی کا دوست تھا لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

رضی ادھیر عمر کا آدمی تھا۔ بدن فرزہ بی پر مائل تھا۔ چہرے را کتابہ بڑا بڑا رہی تھی۔

بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی بیت چکا ہوا اور اب کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کر رہا ہو۔ گزشتہ زندگی کی جھلک اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔

رضی کی آنکھیں بھری بھری تھیں جیسے نہ جائے کیا کیا جذب کر چکی ہوں۔ ان میں دنیا آباد تھی۔ ایک شوخ بیٹھا دنیا جیسے ان آنکھوں سے کبھی رنگ کی پچکاریوں کے فوارے بہے ہوں جیسے وہ بھی سرخ چیزوں کے ملکن رہی ہوں۔ وہ بلا شک پہنچا بھی بھرے ہوئے تھے لیکن اب نہ تو ان میں تلخی تھی نہ شدت۔ مٹھاس کی پھل جوی چل رہی تھی۔ مسکراہٹ اس مٹھاس کو ہوا دیتی تھی۔

”ان سے ملے یہ میرے نئے دوست ایلی ہیں، نام تو الیاس آصفی ہے۔ لیکن مجھے ایلی پسند ہے۔ ایلی، رضی اور رنگی کیا تگڑی ہے۔“

”یہ وہ رضی ہیں۔“ رنگی نے ایلی سی کہنے لگا۔ ”جو اس مردے میں جان ڈالتے ہیں۔“ اس نے طبلے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ہاں تو رضی صاحب آج کچھ ہو جائے۔“ رنگی نے اپنی ستار رضی کی طرف بڑھا دی۔ ”آج تو رضی ایمان سے آگ لگا دو۔ آگ آگ۔ چاروں طرف شعلے اٹھیں۔ اپنے مہربان بھی کیا یاد کریں گے۔

انہیں بھی پتہ چلے کے روپ کے کہتے ہیں۔“

رضی ایسا اور کچھ کہے بغیر اس نے ستار بجانی شروع کر دی۔ رنگی نے طبلہ اٹھایا۔

رضی گانے لگا۔ اے ری عالی پیا بن۔

اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ اکتاہٹ بھری ادا سی پھیل رہی تھی۔ وسعتیں اور بڑھ

رہی تھیں۔ خلا قریب تر آڑتا تھا۔ خاموش ویران خلا۔

”اے ری عالی پیا بن۔“

ایک روز جب رضی اور ایلی اکٹھے تھے تو شریعت آگئیں۔

”آپ بھی درشن کر لیں۔“ ایلی نے رضی سے کہا۔

رضی مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

”آپ کو چھپی نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بہت بے حد،“ رضی مسکرا دیا۔

”تو پھر؟“

”دختی اب نہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ راہ چلتی ہے تھی۔ چاہے راہ چلتی ہو۔ یا

منڈر پر کھڑی ہو۔ کہیں ہو کسی ہو۔

”کیسی ہو۔“ ایلی نے دوہرلیا۔

”ہاں،“ رضی نے کہا۔ ”ہر عورت حسین ہوتی ہے ہر عورت۔“

”کیا واقعی۔“

”ہاں۔“ رضی بولا۔ لیکن اب تو سب بیٹیاں بن گئیں ہیں۔ کوئی عورت رہی ہی نہیں۔“

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بھرا میلا دیکھ لیا۔ بس ہم بھرا میلا چھوڑنے کے قابل ہیں۔“ رضی مسکرا دیا۔

”کوئی تلخی رکاوٹ بن گئی کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ رضی نے جواب دیا۔ ”الثاب تو مٹھاس ہی مٹھاس ہے۔“ اس نے ایک مٹھاس بھری مسکراہٹ چکائی۔

”رنگی تو مصروف کارہے۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا ہے۔“ رضی بولا۔ ”جو مصروف ہے وہ مصروف ہے۔“

”دنیجت کرنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

رضی پھر ہسا۔ ”لوگوں نے ہمیں بہت کی تھیں۔“

"—"

66

”وہ اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ ہم نہیں کرتے کیوں کریں۔ یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔“ رضی مسکرا کر اور پھر چھوٹی آواز میں گانے لگا۔

”اگر دھر کی مریا با جے وسی مدد ہوئن میں راویکاں ناٹھے رائے۔“

گر دھر کی مرلیا بای جے رہے۔
ایلی کے لئے یہ ایک نیا نظریہ تھا۔ کتنا ٹمکیں تھا کہ کتنا پیارا تھا۔

ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اور گر دھر کی مرلیا۔ با جتنی رہی۔ مرلیا کے بول فضا گونج رہی تھے۔ اس کی تکنیکیں ان سروں میں دھوئی جا رہی تھیں۔ شہزاد کے ماتھے کی بندی چمک رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی گر دھر کی ایک را دھکا ہو۔ اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ لفڑت۔

أرشاد عالى

ایک روز جب ایلی چپ چاپ اوس بیٹھا تھا تو ہاجرہ بولی ”ایلی۔“

”کیوں اماں!“ اس نے اماں کی طرف دیکھا۔

”جتنے چھٹی مل سکتی ہے۔ کیا؟“

”کیوں نہیں۔“

تو چاروں کی چھٹی لے لے۔ وہ بولی۔

”کیوں اماں۔“

”سنابے دلی سے حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چل کے انھیں ملیں۔“

ایلی علی یور جانے کا خواہ شمند نہ تھا کیونکہ جب بھی وہ وہاں جاتا تو محلے والیاں اس

پرانگیاں اٹھا تھیں کہتیں اے ایلی دیکھ لیا نا تو نے ان باتوں کا انجام بس آخر دھول ہی اڑتی ہے۔

بوڑھے اسے دیکھ کر تیور چڑھائیے تھے۔ نوجوان مر گوشیاں کرتے۔

لیکن حاجی صاحب کا نام سن کروہ تیار ہو گیا اور وہ چار روز کے لیے علی پور چلے گئے۔ حاجی صاحب ایلی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ”آئیے الیاس صاحب۔“ وہ بولے۔

”بسم اللہ۔ خیر بیت تو ہے۔“ ویسے تو اچھے ہیں آپ؟“

”جی شکریہ۔“ وہ بولا۔

”کہیے وہ طوفان از را گیا ماں۔“

”جی،“ ایلی نے کہا۔

”جن طوفان کو چلانا ہوتا ہے وہ چل کر رہتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی بابا۔“

”اللہ نے آپ پر کرم کیا۔“ وہ بولے۔ ”آپ بھیکنے نہیں۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا اس لیے وہ خاموش رہا۔

”ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

”کیوں ہمیشہ صاحبہ۔“ وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”جی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت آگیا نا۔“

ان شاء اللہ آئے گا۔ وہ بولے۔

آئے گا،“ ہاجرہ نے دہر لیا۔

”زیادہ دری نہیں۔“ وہ بولے۔ ”دھوپ لگنے سے پہلے باڈلوں کو ساف کرنا ہوتا ہے۔ محفل لگنے سے پہلے صفائی ہوتی ہے۔ فرش بچایا جاتا ہے۔ گھبرائے نہیں ہمیشہ صاحبہ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گا۔“

”ابھی تو وہی حال ہے۔“ وہ زیر لب بولی۔ ”ایک قدم نہیں اٹھایا۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرائے۔ ”کوئی چل کر آتے ہیں۔ کوئی تلاش کرنے کے بعد پہنچتے ہیں کسی کو اٹھا کر لا لایا جاتا ہے۔“

”سبحان اللہ۔“ وہ مسکرائے۔

”شادی کا نام نہیں لیتا۔“ وہ زیر لب بولی۔

”وقت کی بات ہے۔“

”کوئی اڑ کی بھی ملے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”پہلے ہی خیا میں رکھا ہوتا تو آج بات کی شکل ہی اور ہوتی۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

ایلی ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

حاجی صاحب کی باتیں بے حد سادہ تھیں اس کے باوجود وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ مسکرا رہی تھی ظاہر تھا کہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہار جرہ تو سمجھ لے اور وہ نہ سمجھ سکے۔

اس روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ذہن کے علاوہ کسی اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قابلیت کیا تھی اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا۔

بہر حال ایک بات تو مسلم تھی کہ حاجی صاحب کو ہر بات میں خلوص تھا۔ وہ پہنچ نہیں تھے۔ صحیح مرشد تھے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

حاجی صاحب دراصل اپنے کسی مرید کی سفارش کرنے کے لیے علی پور آئے تھے۔ وہ مرید خود دلی جا کر انہیں ساتھ لایا تھا۔ وہ آصفی محلے کا فرد نہ تھا۔ اور حاجی اس کے گھر ڈھرے تھے۔

دو ایک مرتبہ وہ آصفی محلے میں آئے تھے تاکہ لوگوں سے مل سکیں۔ آصفیوں کی مسلسل منتوں کے باوجود انہوں نے ان کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اندر میں حالات ان کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔

حاجی صاحب کے اس مریض نے اپنے مکان میں ایک کمرہ ان کے لیے خالی کر دیا تھا۔ کوہ وہاں اطمینان سے رہ سکیں۔

ان دونوں رمضان شریف کے دن تھے حاجی صاحب سے ملنے کے لیے رفیق اور یوسف بھی آئے ہوئے تھے۔ یوسف نے اتنی لمبی داراہی رکھی ہوئی تھی۔ رفیق پکا نمازی تھا۔ دونوں روزے رکھتے تھے۔ لیکن ایلی نے کبھی روزہ نہ رکھا تھا۔ صبح آٹھ دس بجے کے قریب وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف چلے جاتے اور سارا دن ان کے ساتھ باقی کرتے رہتے۔ پھر تین چار بجے کے قریب وہاں سے گھر آ جاتے۔

ایلی رفیق اور یوسف کی باقی سن کر حیران ہوتا تھا۔ یوں باقی کرتے اور مسئلے مسائل پوچھتے جیسے کوئی بڑے مولا نہ ہوں۔

ان کی باقی سن کر ایلی کو وہ دن یاد آ جاتے جب وہ تینوں مل کر جلیل کی طرف جایا کرتے تھے۔ اور جلیل مست آنکھیں بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں جھاڑو دیتے ہوئے باہر گلی میں نکل آتے اور ساری گلی میں جھاڑو دیتے لگتی تھی۔ اس وقت بار بار رفیق کھڑکی سے باہر جھانکتا اور اس کے منہ سے ”سی سی۔“ کی آواز آتی۔ جیسے اسے بہت کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔ باہر گھن میں یوسف قلابازیاں لگاتا اور بندروں کی طرح ناچتا۔

اب وہ دونوں معزز سے بنے بیٹھے تھے اور شرح کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے بحث کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ جلیل تو بالکل ہی نمازوں اور وظائف میں کھو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے بدلتے ہیں۔ ایلی سوچتا۔

ایلی محسوس کرتا تھا کہ ڈنی طور پر وہ وہی ایلی ہے جو اس ذمانتے میں تھا۔ اس کے

خیالات بالکل وہی تھے۔ ان کی بنیاد اور تانے بننے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے خیالات کی لکیریں کچھ اور پھیل گئی تھیں لیکن ان کے پھیلاو کی سمت وہی تھی۔ رخ وہی تھا۔ کوسوں دور۔ ان میں انسانیت تھی۔ برابری کا احساس تھا۔ اور ان کے دل میں ہر شخص کے لیے ہمدردی تھی۔

بڑا انسان

ایک روز جب ایلی ان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
”الیاں صاحب اب کی باراپ نے ہم سے کچھ پوچھنا نہیں۔“
”جی۔“ ایلی نے ان کی طرف دیکھا۔
”دلی میں تو آپ نے ہم سے بڑی باتیں پوچھی تھیں۔“
”جی،“ وہہ منئے لگا۔

”وہ مرہم کی بات یا وہی ہے آپ کو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ زمانے گئے مرہم کی بات پوچھنے والے۔“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”انشاللہ بہتر زمان آئے گا۔“

”جی۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے

”وہ پریشانی تو نہیں رہی نا۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پریشانی بھی نہیں۔“

وہ مسکراتے۔ ”پریشانی بھی لگاؤ کی دلیل ہوتی ہے۔“

ایلی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ نفیات کا وہ باریک نقطہ ایک سادہ آدمی سے سن کر اسے حیرت ہوئی۔

”تو آپ آزاد ہو گئے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”جی آوارہ ہوں۔“

”آوارگی۔“ کبھی منزل کی طرف بھی لے جاتی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولے۔ لیکن کوئی منزل ہو بھی۔

”کبھی منزل خود را ہی کے سامنے آ جاتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہاں کبھی راہی ہیں۔ کسی کو منزل کا شعور ہے کسی کو نہیں و یہ راہی سمجھی ہیں۔“

”منزل کو کرنا کیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”سبحان اللہ۔“ اچھا خیال ہے۔“ وہ بولے۔

ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ عجیب مرد ہے اس کی بات رو بھی کرو تو بھی سبحان اللہ کہتا ہے۔

”انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا۔“ حاجی صاحب بولے۔

”کون سا دن؟“ ایلی نے پوچھا۔

”آئے گا ضرور آئے گا۔“ وہ بولے ”ہم تو شاید نہ ہوں گے۔“ وہ مکرانے۔

اسی شام چار بجے کے قریب جب حاجی صاحب لپٹھے ہوئے تھے اور رفیق یوسف اور ایلی آپس میں باتیں کر رہے تھے تو نہ جانے کس بات پر انہوں نے حاجی صاحب کی رائے پوچھنے کے لیے انہیں پکارا۔

حاجی صاحب چپ چاپ پڑے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سو گئے ہیں۔“ رفیق نے کہا۔

”اُرے یہاں کے دانت تو دیکھو۔“ ایلی نے کہا۔

وہ سب حاجی صاحب پر جھک گئے۔ حاجی صاحب کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے مقلد ہو گئے ہوں۔

”اُرے۔“ ایلی چلایا ”یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔“

رفیق نے انہیں جنخنوڑا لیکن وہ جوں کے توں پڑے رہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔

رفیق نے ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

حاجی صاحب کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ رفیق ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔

ڈاکٹر نے آکر لوٹیاں لگائیں اور پھر ایک بوتل سنگھائی۔

حاجی صاحب کی آنکھیں کھول دیں۔

جب وہ ان کے منہ میں دعا اندیشے لگئے تو حاجی صاحب بنے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کہ انہیں کچھ نہ دیا جائے۔ غالباً وہ روزہ توڑنے کے حق میں نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مریض کو بے حد نقاہت ہے۔“ ویسے گھبرا نے کی کوئی بات نہیں۔ ”ڈاکٹر کے آنے پر کئی ایک محلے دار بیٹھک میں آگئے اور مریض کی صحت کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہ مرید جس کے حاجی صاحب مہمان تھے کا رخانے میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ایک بوڑھی عورت آ کر حاجی صاحب کو دیکھتی رہی پھر رفیق سے کہنے لگی۔ ”بے ہوش نہ ہو تو بیچارہ کیا کرے۔“

”کیوں اماں۔“ یوسف نے پوچھا۔ ”بات کیا ہے۔“

”اے تین دن سے یہاں پڑا ہے یہ اور نہ سحری نہ افطاری۔“

”کیا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔

”گھروالا تو کام پر رہتا ہے اسے کیا خبر کہ مہمان کی کیا حالت ہے۔“ بڑھیا نے کہا۔ ”اوہ گھروالی کہتی ہے۔ میں تو نہ سمجھوں گی کھانا۔ میں کیا نوکر ہوں کہ اس کے دوستوں کی خدمت کرتی پھراؤ۔“

”کیوں۔“ رفیق نے پوچھا۔

”بس ضد اور کیا۔ بڑی بد مزاج ہے۔“

ایلی یہ سن کر حیران رہ گیا چار روز سے وہ روز وہاں سارا سارا دن گزارتے تھے

لیکن حاجی صاحب نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ سحری اور افطاری کے بغیر روزے رکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کام سے وہاں نہیں آئے تھے بلکہ مرید کی سفارش کرنے آئے تھے جس کی بیوی انہیں بھوکوں مار رہی تھی۔

اس روز وہ تینوں افطار کے وقت وہیں رہے۔ فتنق اور یوسف افطار کے لیے کچھ پھل لے آئے اور نبیوں میں حاجی صاحب کی منتین لکیں کہ وہ آصفی محلے میں جا کر ٹھہر میں مگر انہوں نے انکار کر دیا ہے لیکن نہیں جن کے ہاں میں مہمان ہوں وہ ہر امانتیں گے ان کا دل سکھے کا۔ ایسا اس بذریعے کو حیرت ہے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا انسان تھا۔

پوٹ

جب ایلی گروپن واپس پہنچا اور رنگی سے ماتوان نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاس بیٹھا ہے۔

”یہ مانی ہے۔“ رنگی بولا۔ ”ویسے میرا بھتیجا ہے لیکن ہربات میں مجھ سے چار قدم آگے ہے۔“ وہ مسکرا لیا۔

مانی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا رنگ رنگی کی نسبت بہت گورا تھا خدو خال ستواں تھے جسم موزوں تھا۔ بال گھنٹھر پالے تھے اور طبیعت میں لا ابالی پن اور ساتھ ہی محبوبانہ بے نیازی تھی وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا پکارا گلگنڈارہا تھا۔
”آپ سے مل کر سرت ہوئی۔“ مانی نے کہا اور پھر اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر گیت گنگنا نے اور شریعتی کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

”آپ کالج میں ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”اب تو نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔“

”کیا ملازمت کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”نوکری کیا ہے۔“

”پوٹ ہوں۔“ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

”پوٹ،“ ایلی نے حیرت سے دہرایا ”نظمیں لکھتے ہیں کیا؟“

”نظمیں لکھتا ہوں ڈرامے تج لکھتا ہوں۔ شوکا اہتمام کرتا ہوں سمجھی کچھ۔“ اس نے بے پرواہی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”لا جواب نوکری ہوئی نا۔“ ایلی نے کہا۔

”بے کار۔“ وہ بولا۔ ”میکم آنکھوں میں آنکھیں ڈاتی ہیں۔ لڑکیاں مسکاتی ہیں صاحب گھوٹتا ہے۔ اسی روز جان سے مار دے گا۔“

”تم تو روتے ہی رجتے ہو۔“ رنگی منکر ریا۔

”رونق سے کون منکر ہے۔“ مانی بولا۔ ”رونق کا تو میں بھی قائل ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جان کا روگ نہ بنیں تو۔“ مانی نے کہا۔

”نہ بناؤ۔“ رنگی بولا۔

کون بناتا ہے زبردستی بنتی ہیں۔“ مانی نے بے نیازی سے کہا۔

اتھنے میں شریعتی آگئی۔ رنگی دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”لو بھتی۔“ وہ بولا۔

”اب تو خاموش ہو جاؤ۔ شریعتی پہلے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہو گیا۔“

”یاہ۔“ مانی بولا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔“

”تمہیں کیا پتہ یہ ظالم تو جے جے ہے۔“ رنگی نے جواب دیا۔

”جے جے تو نہیں خالی دنی ہی ہے۔“ مانی نے کہا۔ ”ابتدہ وہ دوسرا میں والی پتلی جو ادھر رہتی ہے۔ وہ ہے کچھ کچھ۔“

”وہ وہ تو شہزادی ہے شہزادی۔“ رنگی نے کہا۔

”شہزادی تو نہیں خیر۔“ مانی بولا۔ ”خاصی ہے۔“

”شہزادے کو جو بھی میسر ہو وہ شہزادی ہوتی ہے۔“ رنگی مسکرا یا۔

شہزادہ تو جھک مارتا رہتا ہے۔ مانی ہنسا اور پھر دھوپ میں بیٹھ کر گیت لگانے لگا۔

ایلی اس کی باتیں حیرانی سے سن رہا تھا۔ عجیب لوگ تھے۔ ڈنی چمک تھی۔ رنگین تھی اور جوانی بھی۔

ایلی ہمیشہ ان شخصیتوں کو پسند کرتا تھا جن میں ڈنی چمک ہو جو سمجھی خول سے آزاد ہوں۔ لیکن حال میں وہ سوچنے لگا تھا کہ صرف ڈنی چمک ہی کافی نہیں۔ وہ حاجی صاحب تھے ان کی شخصیت میں اس قدر ہی جاذبیت پیدا کر رہی تھی۔ ان میں ڈنی چمک قطعی طور پر مفقود تھی۔ لیکن باقیں یا زندگی کی پچکاریاں نہیں تھیں۔ پھر وہ شخصیتیں دوسرے کو گود میں کیوں لے لیتیں تھیں۔ وہ جاذبیت اس کی ڈنی چمک کی جاذبیت سے کہیں زیادہ پر اثر تھی۔ بے شک ڈنی چمک میں اٹھان تھی۔ پھیلا دنہیں تھا۔ وسعت نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رضی میں بھی پھیلا وہے وسعت ہے۔ اگر مانی اور اگر رنگی کی باتوں کی رنگینی تھی تو رضی اور غلام کی خاموشی رنگین تھی۔ رنگی میں گرفت تھی رضی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رضی میں پیار بھری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رضی مسلسل سورج تھا جس میں سے ہر وقت شعاعیں لکھتی تھیں اور گرماتی تھیں۔

مانی اور رنگی کی گفتگو صرف لڑکیوں تک ہی محدود نہ رہتی تھی۔ کبھی وہ راگ و دیا پر بحث چھیڑ لیتے اور مختلف راؤں کے تاثرات پر گر مجوشی سے باتیں سیاست میں ان کی دلچسپی محس اخباری قسم کی تھی۔ ایلی خود سیاست میں کو راتھا۔ اسے سیاسی مسائل سے قطعی طور پر لاگاؤ نہ تھا۔

گروپن میں ایلی کا مرکز رنگی کی بیٹھ کھی۔ مدرسے سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر جاتا اور چند ایک منٹ رسمی طور پر وہاں ٹھہر کر عالی کو اٹھا کر رنگی کی بیٹھ میں پہنچ جاتا۔

عالی کے ذہن پر ایک خوف طاری رہتا تھا۔

پہلے ایک روز ناگاہ ابو گھر چھوڑ گیا تھا اور وہ اپنی امی کے ساتھ کیلارہ گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ابو کہاں کیا اس کے بعد اس کی امی نہ جانے کہاں سے آگیا تھا۔ اور اسے اٹھا کرنے جانے کیا تھا۔ اسے امی اول ابو کا یہ بھیڑا سمجھ میں نہ آیا تھا۔

جب بھی ایلی گھر تھا یہ نکلتا تھا کہ عالی ٹھہر ا جاتا۔ اسے یہ ڈر لائق ہو جاتا کہ شاید وہ لوٹ نہ آئے اب تو گھر میں امی بھی نہ تھی۔ ابو چلانے جائے گا تو کیا ہو گا۔ گھر میں ہاجرہ تو تھی لیکن عالی کو ہاجرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہاجرہ کا ہونا یا نہ ہوتا رابر تھا۔

عالی کا یہ خوف ایلی کے لئے بہت بڑی مشکل تھی وہ باہر نہ جاسکتا تھا۔ سکول جانے میں اسے بے حد وقت ہوتی تھی۔ عالی رو نے لگتا۔ اور ایلی کے دل پر ٹھیس سی لگتی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ وہ ایک مرتبہ ایلی نے اسے سکول لے جانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار وہ ساتھ چلا بھی گیا لیکن وہ وہاں اداس پر بیشان حال رہا۔ اس بھیڑ میں ابو کا بھی ہونا نہ ہونے کے برادر تھا۔

سکول سے آنے کے بعد بہر حال ایلی اسے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ اور رنگی کی بیٹھ میں تو وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ درہتے تھے۔ اس پر رنگی ہفتا۔ ”یہ باپ اور بیٹا بھی عجیب ہیں۔ جہاں ایک ہو گا، دوسرا بھی قریب ہی ہو گا کہیں۔ ایلی اور عالی کیا جوڑی ہے۔“

”وہ دونوں بیٹھ ستار سنتے۔ رضی گانا سنتے اور مانی اور رنگی کی محبتوں اور یارانوں

کے قصے سنتے حتیٰ کہ رات کے دس گیارہ نجح جاتے۔ پھر وہ گھر لوٹتے تو ہاجرہ چپ چاپ پیٹھی ہوتی۔ ایلی کو ہاجرہ پر ترس آتا تھا۔ وہ بیچاری بڑھاپے میں پھر سے قید میں پڑ گئی تھی۔

ایک روز ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑی بولی۔ ”ایلی زندگی کس طرح بسر ہوگی۔“

”کیا بات ہے اماں؟“
”دیکھوں۔“ وہ بولی۔ ”آخر میں ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”تو پھر؟“
”تم شادی کر لو بیٹا، ورنہ یہ یور کا کس طرح ہیلے گا۔“
”تو کرو۔“ ایلی نے بیٹے پرواں سے کہا۔

ہاجرہ کا خیال تھا کہ ایلی شادی کے نام پر بدک جائے گا۔ شاید وہ ساری عمر وہ سری شادی کے لیے تیار نہ ہوگا۔ ایلی کہ منہ سے یہ بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔

”تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں نہ۔“ اس نے پوچھا۔

”ہو جائے تو بھی اعتراض نہیں۔ نہ ہو تو بھی نہیں۔“

”تو کہاں کرو گے؟“

”کہیں بھی۔“ وہ بولا۔

” محلے والے تو نہیں دیں گے اپنی لڑکی۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولا۔

”تو کہیں سے خود ہی تلاش کرونا۔“

”نہ اماں۔“ وہ بولا۔ ”یہ جننجٹ مجھ سے نہ ہوگا۔“

”تو تمہاری پسند کیسی ہوگی؟“

”کوئی بھی ہو تو منظور کر لو گے؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”صرف ایک بات ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جس روز اس نے عالی سے بدسلوکی کی میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔“

”باجرہ نہس پڑی۔“ اے تم اپنے دوست سے کیوں نہیں کہتے۔“

”کس سے۔“ وہ بولا۔

”اس رنگی سے۔“

”میں تو نہ کہوں گا۔“

”تو پھر میں کہوں۔“ باجرہ نے کہا۔

”کہہ دیکھو۔“

”یہ تو اچھے لوگ دیکھتے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔“

”شاید کوئی اچھار شستہ ڈھونڈ دیں۔“

”شاید۔“ وہ بولا۔ اور پھر عالی کو اٹھا کر رنگی کی طرف چلا گیا۔

ایلی کی رنگی کی بیوی سے ملنے کا اتفاق یہ ہوا کہ اسی روز جب چائے کا وقت ہوا تو غیر از معمول بیٹھک میں چائے پینے کی _____ بجائے رنگی اسے گھر کے اندر زنانے میں لے گیا۔ اور بیوی نگہت سے اس کا تعارف کرا دیا۔ نگہت کو دیکھا کر ایلی گھبرا گیا۔

نگہت خوبصورت تھی اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ نگاہ بے نیازی سے لبریز تھی۔ ہونٹوں میں رنگی کی جھلک تھی۔ ٹھوڑی میں دلبی ہوئی انہی ساطھی۔ جوانی تھی۔ بے تکلفی تھی۔

ایلی اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ بلکہ نگہت میں رنگی اور رضی کی آمیزش دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس میں وہی برداشت تھی جو رضی اور غلام میں تھی۔

وہی مٹھاں تھی اور اس کے باوجود نمائیت کی تمام تر رنگی اور شوئی بھی تھی۔ یہ متضاد خصوصیات ایک جگہ کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں وہ حیران تھا۔

غلہت کو دیکھ کر ایلی کی شریعتیوں پر غصہ آنے لگا۔ رنگی کیون جھک مار رہا تھا۔ کیوں پھول پھول اڑ رہا تھا۔ جب کہ ان کے اپنے کھر میں بہار آئی ہوئی تھی۔ بلکہ ایک روز اس نے رنگی سے اشارہ یہ بات کہہ بھی دی۔ رنگی کا شہر خوش سے تھتا اٹھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھانا غلہت واقعی میری زندگی کی بہار ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی ہے جبھی تو مجھے اس سے اس قدر عشق ہے والہان عشق۔“

ایلی کے ہونٹ پر طنزیہ مسکراہٹ دیکھ کر رنگی چلا یاں۔ ”تمہیں یقین نہیں آیا کیا۔ غلہت میری روح کی روشنی ہے جسم کی بات چھوڑ دے۔“ اور یہ جو نیریاں ہیں تمہاری۔ ایلی نے پوچھا۔

”اجی ان کی کیا حیثیت ہے۔“ رنگی نے کہا۔ ”اگر غلہت کو زکام ہو جائے اور اگر ان تمام فن فنیریوں کا بھرتا بنا کر کھلانے سے اس کا زکام دور ہو سکتا ہو تو میں ذرا تامل نہ کروں۔“

رنگی بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح متضاد باتیں کیے جا رہا تھا۔ عین اس وقت مانی نے شور مجا دیا۔ ”بھٹی اوہر کی بھی خبر لو۔ بیچاری دھوپ میں کھڑی ہے۔ تمہارے لیے۔“

”تھلی ہے کیا؟“ رنگی اچھل کر بولا۔

”ہاں ہاں۔“ مانی نے چلا یا۔

رنگی نے دو چھلانگیں ماریں اور بیٹھ کے باہر نکل گیا۔

”کی غلہت بر انہیں مانتی۔“ ایلی نے مانی سے پوچھا۔

”بہت۔“ مانی بولا۔ ”کڑھتی ہے۔ لیکن بھٹی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوں گے۔“

”وہ بھی تو نگہت ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بے پرواٹی سے بولا۔ ”نگہت کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب کی محبوبہ ہے۔ جلت محبوبہ ہے۔ ہم سب اسے پیار کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ اسے بغیر پیار کرنے کے کوئی نہیں رہ سکتا۔ وہ میری محبوبہ ہے۔ میلی ہے۔ راز دان ہے۔ اور وہ میری ماں ہے ماں۔ اُو ہم پل کراس سے عشق لڑائیں۔“ مانی اندر جا کر نگہت کی گود میں سر کھکھ لیت گیا۔ ”مامی۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو تباہ ہو گئے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”بس ہر بار ہو گئے۔“

”وہ مسکرائی۔“

”کوئی خاطر میں نہیں لاتی۔“

”تخت ت۔“ اس نے مذاق سے منہ بنایا۔

”اچھی مامی کسی ایسی اڑکی کا پتہ دو کہ مزا آجائے۔“ بنے حد خوبصورت ہو۔ رنگیلی ہو۔ طرحدار ہو تمہاری طرح۔ پھر دفعتاً چلا یا۔

”یہ ہمارا ایلی ہے اس کی بات بناؤ کہیں۔“

”کیسی بات؟“

”اے اچھی سی بیوی دلا دو۔“

”اچھا۔“

”بس یہ کام کرو۔ ساتھی تلاش کروینا۔ بیوی نہیں۔“ مانی نے کہا۔

”بیوی کیوں نہیں؟“

”بیوی بڑی بھدی شے ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

”پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟“

”الو کے پٹھے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اور تم۔“

”میں بھی ہوں۔ الوکا پٹھا۔“

”کیوں ہو؟“ وہ نہیں

”ماں باپ نے بنادیا بس۔“

”نہ بتتے۔“

”زیر دستی بنادیا ہے اب کہیں ایلی کوالوکا پٹھانہ بنادینا۔ خیال رکھنا۔“

”ہے۔“ رنگی چلا تا ہوا اندر واخل ہوا۔ ”میری پیاری کودکی کو دشمن بے کرو۔“
غلہت رنگی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”بس تمہارے بن میرا ام نلتاتا ہے۔“ رنگی نے پیار سے گلہت کی طرف دیکھا۔

”ہم تو بس تمہارے بغیر یقین ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی اور وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔

پاک بابا

ایک صبح باجرہ بولی آج میں نے خواب میں پاگ بابا کی زیارت کی۔

”پاگ بابا؟“ ایلی نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔“

”کیوں؟“

”دیر سے ان سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔“

”تو پھر۔“

”جانا ہی نہیں ہوا۔“

”کیوں۔“

”بس جھن جھنوں میں پڑ رہی۔“

”ہوں۔“ ایلی بولا۔

” حاجی صاحب کیا پاگ بابا کی زیارت کراؤں۔“ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔

” تو وہ کیا کہنے لگے۔“

کہنے لگے ”اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضری دینا اچھا ہوتا ہے۔“ میں نے پوچھا تو ہوں آؤں بھی کہنے لگے ہاں ہاں کیا حرج ہے۔“

” تو پھر ہوا وہ کہاں ہیں وہ۔“ ایلی نے کہا۔

” لو ایلی کیسے جاؤں۔“

” تو کسی کو ساتھ لے جاؤ۔“

” تم کیوں نہیں چلتے،“ اس نے پوچھا۔

” میں جا کر کیا کروں گا۔“

” حرج بھی کیا ہے۔ تم بھی کر لینا۔“ ہاجرد ہوں۔

” کیا فائدہ۔“

” وہ ہنسی۔“ لوالہ کے بندوں سے ملنے کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔“

” کیا ہوتا ہے۔؟“

” تقدیر بدلتی ہے۔“

” اب تقدیر بدلت کر کیا کرنا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ہوں۔ ” ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے تیری۔“

” ماں تو میری زندگی کی بات چھوڑ۔“ ایلی نے کہا۔

” کیسی باتیں کرتا ہے۔“ وہ ہوں۔ ” چل اپنے لیے نہ سہی۔ میری خاطر چل۔“

” کیا کروں گا وہاں جا کر۔“

” تو چل تو سہی۔“

پاگ بابا امر تر علی پورٹرک پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک

بہت بڑی پکڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پکڑی باندھی ہوئی نہ ہو بلکہ لٹھا سا بنا کر سر پر رکھلی گئی ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا چغہ لکھتا تھا۔

ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بستر، ایک مٹی کا پیالا۔ ایک لوٹا۔ اور ایک تھالی پڑی تھی۔ یہ بابا کا جملہ سامان تھا۔ اے بھگی کسی نے بیٹھنے نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ سڑک پر ادھر سے ادھر سے ادھر گھومتا رہتا۔ چھاتی ابھری رہتی، گردون آٹھی رہتی۔ اے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے پولین جہاز کے تنخے پر گروپیش کا جائزہ لے رہا ہو۔

پھر وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن نماز پڑھنے کے لیے وہ سڑک سے بہت کر قریب ہی چھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ واپس سڑک پر آ جاتا۔ بابا کو کبھی کسی نے سوتے احتی پیتے نہ دیکھا تھا۔

اللہ سے بیاہ

ریتی پور کے گاؤں میں ایک روز جب لوگ مسجد میں گئے تو بابا وہاں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا مختصر سامان جس میں ایک چھوٹا سا بستر بھی شامل تھا۔ جمرے میں رکھا ہوا تھا۔ گاؤں والوں سمجھا کہ مسافر ہے۔ شاید ستانے کے لیے وہاں رک گیا ہے۔ دو ایک روز تو لوگ اسے ساگ روٹی بیجھتے رہے۔ تیرے روز ریتی کا نمبردار غصے میں آگیا کہنے لگا۔ ”دیکھ بابا یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ تو اب اپنا راستہ لے۔ یہاں ڈیرہ جمانا غلط ہے۔“ چوتھے روز وہ پھر مسجد میں گیا۔ تو بابا جوں کا توں بیٹھا تھا۔

نمبردار کو طیش آگیا۔ اس نے بابے کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔

بابے نے اپنی پکڑی سر پر رکھی سامان اٹھایا۔ اور ریتی پور کی مسجد سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک پر بیٹھ گیا۔

اس شام نمبردار کی بھینس بیکار پڑے بغیر مر گئی۔ سارا گاؤں حیران تھا کہ بھینس کو کیا ہوا۔ کچھ لوگ کہنے لگے ”تم نے بابا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔“ نمبردار چلانے لگا۔ ”میں نے کیا برائی کیا تھا۔ کیا شریعت کے خلاف بات کی تھی۔ سیدھی بات ہے میاں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ وہاں جا کر نماز پڑھو۔ میلاد کرو۔ عبادت کرو اور اگر کوئی مسافر ہو تو بے شک دو دن کے لیے وہاں ٹھکانہ بھی بنا کر لے۔ پر یہ کیا ہوا کہا سے گھر بنا کر بیٹھ جانے؟“ نمبردار نے بھینس کی موت کو بابا کی بدعا کا نتیجہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے روز جب وہ جو یہی میاں گیا تو ایک اور بھینس مری پڑی تھی۔ ”ارے۔“ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ آٹھ روز جب اس کی میتوں بھینسیں بے وجہ مرنگیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی منتیں کیں ”میں تباہ ہو گیا۔“ یہ کیا مصیبت آپڑی ہے مجھ پر خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ضرور یہ اس بابا کی بدعا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میری تو بہے میں اس کے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس سے معافی لے دو۔ وہ تباہ ہو جاؤں گا۔“

وہ سب مل کر بابا کے پاس گئے۔ لیکن بابا چپ چاپ بے نیازی سے سڑک پر ٹھلتا رہا جیسے اسے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ای نہیں ہو۔ ویرتک وہ چیختے چلا تے رہے لیکن بابا اپنی ہی دھن میں ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر سڑک نانپنے میں مصروف رہا۔

اسی شام وہ پھر بابا کے پاس گئے۔ انہوں نے منتیں کیں۔ کہ وہ پھر مسجد میں آبیٹھے۔ وہ اسے گاؤں میں ایک مکان دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب تھے بشرطیکہ وہ گاؤں والوں کو معاف کر دے۔ لیکن بابا نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔

پھر اگلے روز انہوں نے گاؤں کے وارے میں بیٹھ کر مشورہ کیا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز پیش کی۔ لیکن دو لے چمار کی بات سب کو پسند آئی۔ اور انہوں نے اس پر

عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک آدمی سڑک پر جا بیٹھا کہ بابا پر نگاہ رکھے۔ گاؤں کے دس ایک آدمی وضو کر کے انتظار میں بیٹھ رہے۔ جب بابا نماز پڑھنے کے لیے گھیت میں گیا اور نیت بامدھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب بھاگے اور بابا کے پیچھے قطار بننا کر نماز پڑھنے لگے۔

جب بابا نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور اس نے پیچھے دیکھا کہ گاؤں والے اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ چلانے لگا۔ ”جاو جاو۔ اللہ میرے پیچھے مت بیٹھو۔ تم نے اللہ سے بیا وہیں کیا۔“ گاؤں والوں میں سے ایک بولا۔ ”تم تمہارے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑیں گے۔“

جب تک تم ہمیں معاف نہ کرو۔“ ”مت پڑھو!“ ”بابا چلایا۔“ ”تم نے اللہ سے بیا وہیں کیا۔“ ”تو کہہ دو گاؤں والوں کو معاف کیا۔“ وہ بولے۔

”اللہ معاف کرے گا۔“ ”وہ بولا۔“ ”جاو جاو۔“

”اللہ نہیں کرے گا۔ جب تک تم نہ کرو۔“ گاؤں والوں نے کہا۔

”جاو جاو۔“ ”بابا بولا۔“ میں کون ہوں۔ میں کچھ نہیں میں کچھ نہیں۔ جاو۔“

”چاہے تم کچھ نہیں۔“ گاؤں والوں نے کہا۔ ”جب تک تم یہ نہ کہو گے کہ جاو معاف کیا ہم نہیں جائیں گے۔“

”بابا اٹھ بیٹھا۔ وہ کھیتوں میں گھونمنے لگا۔“ پلے پلے تنگ کرتے ہیں۔ شگ کرتے ہیں۔ ”گاؤں والے وہیں بیٹھ رہے۔“

”جاو۔ جاو۔“ ”بابا بار بار ان کے قریب آ کر چلاتا۔

”کہو معاف کیا۔“ وہ جواب دیتے۔ ”بابا پھر گھونمنے لگتا۔“ میں کون ہوں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔“

دیر تک وہ یوں ہی چلاتا رہا۔ پھر بولا۔ ”جاو معاف کیا جاو جاو۔ اللہ سے بیاہ کر

لو سب اللہ سے بیاہ کر لو جاؤ۔“

اس کے بعد انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ بابا گاؤں میں آرہے لیکن بابا ان کی بات نہ سنی اور وہ ہیں سڑک پر گھومتا رہا۔

بابا کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اردو گرد کے علاقوں کے لوگ بابا کے پاس آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ بابا نہ بیٹھے گا نہ بات کرے گا۔ لہذا لوگوں نے آگ کر بابا کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ بات کرنی ممکن نہ تھی مگر وہ سلام تو کر سکتے تھے اور رسم اس قدر عام ہو گئی کہ سڑک پر چلتی ہوتی ہوئی بسیں لا ریاں اور موڑیں بابا کے دیرے کے پاس آگز کر جاتیں۔ درایور انہیں بند کر دیتے اور پھر از سر نو گاڑی میں شادرث کے چال پڑتے ہیں یہ ان کی سلامتی تھی۔

براتیں رک جاتیں۔ بینڈ انگریز می نیشنل اسٹم بجاتے اور سلام کے بعد خاموشی سے پھر پڑے را گیئر رک جاتے۔ سلام کرتے اور پھر چل پڑتے۔

اور بابا اتنی بڑی پاگ سر پر کھے سڑک پر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر، چکر لگاتا رہتا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوتی۔ گردن تھی ہوتی۔ سراو پر کی طرف اٹھا ہوتا اور وہ ادھر ادھر یوں دیکھتا جیسے جہاز کا کپتان ہو۔ حالات کا جائزہ لے رہا ہوا اور جہاز کو کھینچ کر پار لے جانے کے متعلق ملاحوں کو احکامات صادر کر رہا ہو۔“

میں کیا کروں

جب ہاجرہ ایلی وہاں پہنچے تو بابا کھیت میں بیٹھا نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ ہاجرہ
چپکے سے بابا کے پیچے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ ایلی عالی کو اٹھائے قریب ہی بیٹھے
کر شنکے سے زمین کریڈ نے لگا۔

نماز سے فارغ ہو کر بابا نے مرکر دیکھا۔ ”تم نے اللہ سے بیاہ کیا ہے؟ وہ چلایا۔

”کیا ہے بابا جی۔“ ہاجرہ نے جواب دیا۔

”اچھا کیا۔“ وہ بولا۔ ”اچھا کیا۔“

”بابا جی یہ میرا بیٹا ہے۔“ وہ ایلی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اُدھر آئیں۔ ادھر آ۔ بابا کے سامنے۔“

ایلی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بابا نے ایلی کی طرف دیکھا غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تمہارا بیٹا ہے۔“ فقطاً وہ بولا۔

”جی بابا۔“ بآجرہ بولی۔

”تمہارا بیٹا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔“

”دعا کریں آپ۔“ وہ بولی۔

”میں کون ہوں۔“ وہ چلا یا کہ دیکھ لیں کون ہوں گے دعا کروں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ بآجرہ بولی۔

”اللہ اپنے آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرے وہ سب کرتا ہے میں کون ہوں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ بآجرہ نے پھر دوہرایا۔

”سبھی اللہ کے ہیں۔ میں بھی ہوں پھر میں کیا کروں۔“ پھر وہ انھوں بیٹھا اور وہیں کھیت میں چکر کاٹنے لگا۔

”وہ سب کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے کون کرتا ہے پھر کون کرتا ہے۔ وہی جانے۔ اسی کے کام ہیں وہی جانے۔ میں کیا کروں۔“ دیری تک وہ میں کیا کروں کی رٹ لگاتے ان کے سر پر منڈلاتا رہا۔

پھر وہ ایلی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

”کیا نہیں کیا؟_____۔“ بابا چلایا۔ ”کیا نہیں کیا؟“ جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرا لگایا تو حضرت شاہ غور نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لیا تھا، نہیں لیا تھا؟“

اسیل نے ڈیرہ کا نام بابا کہ منہ من کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا نہیں کیا اس نے؟“ بابا چلا۔ ”وہ پھر چکر کائے لگا۔ واپسی پر وہ پھر ایلیے روپروکھڑا ہو گیا۔

اور تم وقت پر وہاں سے نکال دیا۔ اور تمہیں چٹے کڑے میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“ چٹا کٹھا۔ ایلی کو امر تسریادا آگیا۔

”اور پھر تمہارا منہ کالا کر دیا۔ اور تم چلتے پھرتے رہے اور لوگ چلتے پھرتے رہے۔ اور تم ان کو دیکھتے رہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہے۔ پرانہوں نے تمہیں نہ دیکھا۔“

کیا نہیں کیا؟ کیا نہیں کیا؟ پھر وہ بیوانہوار چکر کا تارہا۔ کہتے ہیں نہیں کیا نہیں یا تو نہیں کیا کروں۔ چلو نہیں کیا۔ پھر تم کو ٹھوکتے ہوئے والے نہیں کیا۔ سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ پھر وہ ایلی کے روپروکھڑا کر کھڑا ہوا۔ ”کیا نہیں کیا۔“ وہ چلایا۔ ”پھر تمہیں داتا کے قدموں میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“ وہ بولا۔ ”بولو۔ دی۔ دی۔ وہ دینے والا ہے۔ ہم کون ہیں۔ ہم کون ہیں وہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ دینے والا اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

بابا پھر ایلی کے روپروکھڑا ہوا پھر بولا۔ ”جھنڈے شاہ نے تمہاری حفاظت کی۔ تم پر ترس کھایا۔ تمہیں بچایا۔ رحمت ہو گی اللہ کی بس اسی کی رحمت یہی چیز ہے۔ ہم کیا ہیں۔ ہم کیا ہیں کہتی ہیں کیا نہیں کیا پگلے پگلے۔“ وہ پھر چکر کائے لگا۔

بدھا اور لمبا

”اوراور۔“ وہ رکا۔ ”اس نے تمہارا ناواں لکھا۔؟“ تم نے نہیں لکھوایا۔ تم نے کہا کہ تم اس سے بیاہ کرو گے۔ نہ کرو نہ کرو۔ پھر کیا ہے؟ اس کا کیا؟ وہ تو اپنی رحمت سے بلا تا ہے۔ نہ جاؤ۔ نہ جاؤ پھر کیا ہے؟ اس پر بھی تمہارا ناواں لکھ لیا۔ لکھ لیا۔“ وہ پھر چکر کائے لگا۔ ”خودا نہ ہے ہیں خودا نہ ہے۔ اور کہتے ہیں۔ کچھ نہیں کیا۔

پھر میں کیا کروں۔ کیا کروں ہیں۔“

وہ پھر آکھڑا ہوا۔ ”اس بدھے نے سب کچھ بتایا نہیں بتایا کچھ بولا۔ اس نے تمہارا نواں لکھا ہے وقت وقت کی بات ہے۔ وقت پر ہوتا ہے وقت پر نہیں ہوتا۔ اس بدھے نے کہا وقت آئے گا۔ تم نے پر افواہ کی۔ اندھے ہیں اندھے اندھے ہی اندھے۔“ وہ پھر چکر لگانے لگا۔

ایلی حیرت سے اس بدھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب کھڑے تھے۔ باجرہ کہی ہوئی بیٹھی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بیباخت کسی کسی کو یا اس نے بخایا تھا۔ وہ باجرہ عالی اور ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عالی انکلیوں سے لکیریں سمجھ رہا تھا۔

بابا پھر آگیا۔ ”پھر میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم وہاں جاؤ نہ جاؤ۔ جہاں تمہارا نواں ہے۔ دور بہت دور۔ روئی ٹوپی والا بدھا بیٹھا ہے۔ وہ تم ایسوں سے نپٹ لے گا۔ کنوں کے پاس۔ مسجد کے پاس مددی کے پاس۔ وہ بدھا بڑا جبر و سوت ہے اور اس کا باکا وہ لمبا ہی لمبا اور اونچے قد والا دونوں بیٹھے ہیں جہاں تم نے پہنچنا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ چلایا۔ ”میں کیا کروں جاؤ جہاں تم نے جانا ہے ان سے ہو کر پھر تم نے وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں تمہارا نواں لکھا ہے میں سے ہو کر جانا ہے۔ ”اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔“

دفعتا بابا کو غصہ آگیا۔ ”جاؤ جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔“ اس نے باجرہ اور ایلی کو دھمکایا۔

”اس کو بھی لے جاؤ۔“ اس نے عالی کی بر ف دیکھا۔ ”اس کو جو گل گیا تھا۔ پیٹ میں گل کیا تھا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ غصے میں چلایا۔

”نہیں جاتے، نہ جاؤ نہ جاؤ۔“ تم جانور بدھا جانے میں کیا کروں؟ میں کیا

کروں۔“ یہ کہتا ہوا بابا سڑک کی طرف چل پڑا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے رہے ہاجرہ کے چہرے پر بخز اور انگسار کے تو دے لگے ہوئے تھے عالیٰ ایلی کامنہ تک رہا تھا۔ اور ایلی خاموش بیٹھا تھا چاروں طرف سے دھند کا اس پر یورش کر رہا تھا۔

دھند کے میں کھڑی شہزادگر رہی تھی۔ ” جاؤ۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ” رکاوٹ تو دور ہو گئی۔“ حامی صاحب کا سر ہل رہا تھا۔ ” آئے گا وقت ضرورت گئے گا۔“ وہ مدھم آواز گلگنار ہے تھے۔ ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے انہوں نے اسی سرے کی سلائی لگا رکھی ہو۔

غلام مسکرا رہا تھا۔ اللہ ہی اللہ ہی اللہ ہی اللہ اس کی کہتا ہے سر دھن رہی تھی۔

” اے رہی عالیٰ پیامن۔“ رصل کی آنکھوں سے مٹھاں بھرے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ پیا پیا کوئی چھینٹ ہوئی اڑے جا رہی تھی۔

اس دھند کے میں ایک بدھا میلی سی رومی ٹوپی پہنے فضا کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ایک اونچا لمبا بلما پتلہ انسان چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کنوں ایڑیاں اٹھائے ان کی طرف جھانک رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی مسجد کے مینار گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے درخت با ادب کھڑے تھے۔

جب ایلی گروپن پہنچا تو وہ دھند کا بدستور قائم تھا۔

اس کے بعد ایلی کے احساسات میں نہ جانے کیا ہوا۔ جب بھی وہ رضی مانی اور رنگی کے پاس بیٹھا ہوتا اور رضی کوئی نہ کوئی راگ چھیڑتا۔ ” گہری رے اے ندیا۔“ تو اس کے روپ و ایک وسیع میدان پھیل جاتا۔ گہری ندی کے قریب ایک کنوں ابھر آتا اور پھر پاس ہی ایک مسجد سفید چاور اوڑھے آٹھتی اور ایک مختصری چار دیواری کے اندر سفید نائلوں پر رومی ٹوپی اوڑھے ایک بدھا اپنے ہی دھینا میں مگن بیٹھا ہوتا۔ پاس ہی وراز قدبا ادب کھڑا ہوتا۔

”پون چلت پر دیا۔“ رضی گویا آہیں بھرتا۔ ”وہی دنیا۔“ وہ چادر میں لپٹی ہوئی مسجد اپنا آپ سمیٹتی۔ دور ہوا سیٹیاں بجاتی۔ وسعتیں اور پھل جاتیں۔ کائنات انگڑائی لیتی
پتے سرگوشیاں کرتے درخت جھکتے ندی اور گہری ہو جاتی۔

ایلی رضی رنگی اور مانی کے درمیان بیٹھ کر بھی اسی منظر میں کھویا رہتا۔

”لوہریتی آگنیں،“ رنگی مسکرا یا۔

ایلی کی نگاہ تھے ایک نیلی رومی لوپی ابھری۔

”کیا بونا ساقد تھا۔“ مانی قتلی کو دیکھ کر مسکرا یا۔

ایک بونا ایلی کی رکا ہوں میں بھرتا۔ اور ھر دو راز قد ایلی کی طرف دیکھتا۔ اور پھر پاگ بابا چھتتا۔ ”جاو۔“ چلے جاؤ تم جاؤ اور وہ جانیں میں کون کون ہوں۔“
اور رحمی صاحب کا سر جھولتا۔ ”اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔“
پاگ بابا نے جانے ایلی کو کیا کر دیا تھا۔

لیکن ایلی کا ذہن جوں کا توں تھا۔ وہ ایک مضبوط قطعہ کی طرح اس کے گرد حصار کیے ہوئے تھا۔ یہ بھیگ ہے۔ بابا نے اس کے مااضی کے متعلق اتنی ساری باتیں بتا دی تھیں۔ ضرور بابا میں کوئی طاقت کام کر رہی تھی۔ لیکن ایلی سوچتا اس شعبدہ بازی سے مجھ سا بھدار آدمی کیسے متاثر ہو سکتا ہے۔ شعبدہ بازی ایلی کو حیران کن ضروری کرتی تھی اسے شعبدہ بازی سے چند اس دلچسپی نہ تھی۔ معجزات یا اس نسم کی غیر مرئی طاقت اس کے لئے حیران کن ضرور تھی۔ لیکن وہ اس کے ایمان کو استوار نہ کرتی تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں خدا یا مدد ہب کے لیے جذبہ پیدا کرتی۔ اور نہ ہی وہ ایسے لوگوں کو اللہ والے تسلیم کرنے پر تیار تھا جن سے ایسی طاقتیں کاظم ہوتا۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر چہ وہ بے حد ڈر پوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا خیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا وہ جیم جیمز کی فلکیات ہال دین پکسلے کے

”سائنس کا عجز۔“ سے متعلق مضامین برٹنڈرسل کے فزکس سنتایانا کے جذبات کا وہ نت کریمیں کے مشاہدات اور اسیج۔ جی وائز کی سائنس فلشن کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا۔

ڈر کی بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا اسے اللہ کے بندوں کی طاقتور سے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چونکہ اسے اللہ کی طلب نہ تھی اتر ام قا فقط احترام۔ ویسے وہ اللہ کی محبت سے کو را تھا۔ اللہ سے محبت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ سے محبت صرف اسی سورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب وہا پنی مرلی اٹھا کر یہی اتر آئیں۔ اسے بجا کیں اور کائنات ماد ہو بن میں را وہ کان کی طرح ناچہ اور ان کی مرلی کے سحر تلے بوئے اگ آئیں پھول کھل جائیں اور کوئی چلا کئے پیو پیو۔

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخيّل اس کے لیے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہوتا تھا۔ عظمت عظمت عظمت عظمت۔ محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں سے اخذ کیا تھا۔ اسلام سے نہیں۔

لہذا عجزات کو خاطر میں لانا یا اللہ کے ان بندوں کے سامنے جھکنا بے کار تھا۔ ایسا کی وہنی دنیا بے حد مستحکم اور محفوظ تھی۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا وہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔ شاید اسی لیے اسے ٹھریوں سے محبت تھی چونکہ ٹھریوں کے زیر اثر مرلی اٹھائے لکھ لگائے یہی اتر آئے۔ اور پنگھٹ پر اسے گھیر لیتے۔ اس کی وہنی چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ اس کے فلسفے کی گاگر پھوٹ جاتی اور وہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہو کر را وہ کان بن کرنا چتا۔

لیکن یہ روپی ٹوپی والا بذہا اور راز قد کون تھے۔ جو اس کی پرواہیوٹ زندگی میں

خواہ مخواہ گھسے چلے آرہے تھے۔ لاحول ولاقوہ عجیب بات تھی کہ لاحول پڑھنا بھول جاتا۔ اس کا دل احترام سے بھر جاتا۔ اور پھر نہ جانے کون مرلی چھیڑ دیتا اور کا گناہ ناپھنے ملگتی۔

خاموش عزم

پھر ایلی ہاجرہ اور عالیٰ چند ایک روز کی رخصت پر علی پور چلے گئے۔ علی پور ایلی کے لیے ایک ویرانہ تھا۔ نہ وہاں اس کا دوست تھا۔ نہ کوئی دلچسپی شہزاد کے چوبارے کو دیکھ کر اسے بلکی سی ادا سی محسوس ہوتی تھی۔ اور اس۔ محلے والوں کے دلوں میں ابھی تک اس وقت کی یاد باتی تھی۔ اگرچہ محلے والیاں اسے نہ کر بلاتی تھیں لیکن جلد ہی کسی کے منہ سے زمانہ ماٹل کی کوئی بات صحیح کے رنگ میں نکل جاتی۔

گھر میں علی احمد سے طمطرائق سے رہتے تھے۔ وہ بات بات پر گھروالوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے اور راجو یا شیم کو طمع دیتے رہتے۔

شیم کی دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑی دسویں جماعت پاس کر چکی تھی۔ اور اب کسی مدرسے میں معلمہ تھی۔ چھوٹی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

راجو کا پیٹا شیر علی لاہور میں اپنی بیوی کے پاس رہتا تھا۔ نصیر کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اس کے احمد نے پیش پائی تھی ان کی زندگی میں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن گھر بیٹھے رہتے اور اپنے رجسٹروں میں کچھ لکھتے رہتے۔ نصیر وزیر اور کبیر سے ان کا رو یہ قطعی طور پر مختلف تھا۔ چونکہ اب وہ بیوڑھے ہو چکے تھے اور باپ کی بجائے دادا بن گئے تھے لہذا وہ ہر وقت اپنے بیٹیوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے اور انہیں اپنے خیالات کے انٹیکشن لگاتے رہتے۔

ایلی علی پور پہنچا تو علی احمد نے حسب معمول بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ادھرا دھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گروپن کے متعلق پوچھنے لگے۔

”کیوں بھی۔“ تمہارا جی لگ گیا وہاں۔ یہ اچھا مدرسہ ہے۔ خوبصورت شہر ہے۔ پھر معروف صاحب کی بات چل نکلی بولے ”درالصل تم کیریئر کے لحاظ سے خاصے بد قسمت واقع ہونے ہو۔ ورنہ مکملہ تعلیم کے سمجھی افسرا پنے دوست ہیں اگر تمہارے خلاف شکایات نہ ہوئیں تو نہ جانتے ان کی مدد سے تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔“

اپنے اثر و رسوخ پر نماز کرنے کی علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود بڑے عہدے پر نہ پہنچ سکے تھے۔ اور اپنی تمام تر زندگی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل تھا۔ ایسی ان کی اس عادت سے پورے طور پر واقف تھا لیکن اس میں اس قدر فراخندی نہ تھی کہ ان کی اس چھوٹی سی کمزوری کو برداشت کرتا۔

ان کے منہ سے اپنے دوستوں کی عظمت کا مذکورہ سن کرو۔ جل کٹ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد کا کوئی دوست نہیں۔ لوگ صرف ان کی بذلة تھی کی وجہ سے ان ملتے اور گیسیں ہاتکتے تھے۔ درالصل وہ علی احمد کے کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ علی احمد کی اپنی طبیعت تھی۔ چونکہ وہ بڑے آدمیوں کو ہوا دینے کے قابل تھے۔ ان کا ادب لحاظ محوظ خاطر رکھتے۔ وہ کسی بڑے آدمی سے برادری کے احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔

بہر صورت ایسی میں اس قدر وسعت قلب نہ تھی کہ علی احمد کی اس چھوٹی سی خوشی میں ان کا ساتھ دیتا۔

”دیکھئے ابا جان۔“ وہ بولا۔ ”آپکے دوست آج تک میرے لیے کچھ نہ کر سکے چھوڑ دیئے اس بات کو۔“

اس پر علی احمد کو غصہ آگیا۔ غصہ تو آنا ہی تھا۔ چونکہ ان کا اپنا بیٹا ان کی تمام تراہیت کو یوں یک قلم روک رہ تھا۔

”اگر معروف صاحب ڈائریکٹرن ہوں۔“ وہ جلال میں کہنے لگے۔ ”یا تم میرے بیٹے نہ ہو تو تم ایک روز بھی اپنی نوکری پر قائم نہیں رہ سکتے۔“

”آپ کا مطلب یہ ہے نہ کہ انہوں نے آپ کی وجہ سے میرے خلاف شکایات پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔“ ایلی نے کہا۔

”بالکل۔“ وہ بولے۔ ”یہ میں تسلیم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ میکن ان کیامد اوقبت قسم کی نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ علی احمد بولے۔ ”انہوں نے مجھے سچھنہیں دیا۔ صرف نوکری پر بحال رکھا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ابھی میاں۔“ علی احمد چلا گئے۔ ”اگر وہ نہ ہوں تو تم ایک دن کے لیے بھی نوکری نہیں کر سکتے۔“ ایلی کو غصہ آگیا بولا۔ ”یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ ادنیٰ سی نوکری بھی کر سکوں۔“ وہ بنتے۔ ”میاں تم اپنی قابلیت کے زور پر ادنیٰ سے ادنیٰ نوکری بھی نہیں کر سکتے صرف میری وجہ سے تم اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو یہ ساتھ نے نصیر کی ماں کیا کہا ہے ہم نے۔ کیا کہتی ہے۔ کیا غلط کہا ہے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ بنتے۔ ”یہ ایلی کیا نوکری کرے گا۔ اپنے بل بوتے پر وہ ہم ہی تھے جو بغیر کسی کی مدد کے کسی واسطے کے اتنے سال نوکری کی اور عزت سے کیے۔ کیا کہتی ہے۔“

ایلی کے دل میں زیک عزم بیدار ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گز رتا گیا وہ خاموش عزم تقویت پکڑتا گی۔ ایلی کی تمام ترا نا گویا

اججاج میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ ایک مظلوم جبشی کی طرح تن گئی تھی۔ جبشی کی آنکھیں اپنے خانوں سے باہر نکل آئی تھیں۔ گویا سو جا ہوا تھا۔ بازو تھے ہوئے تھے۔ توڑ دو توڑ دو۔ یہ زنجیر توڑ دو۔ اس کے جسم کے بند بندے سے نظرے بلند ہو رہے تھے۔ ایلی نے اب تک اپنی اہمیت شہزادے اخذ کی تھی۔ اسے وہ محبوب حاصل تھی جس کے لیے آنفی محلے کے تمام افراد چشم برہ تھے۔ لیکن اب اس کی موت کے بعد ایلی کے لیے کوئی الی بات نہ تھی جس پر وہ اپنی اہمیت کو استوار کر سکتا تھا۔ علی احمد کی اس سرسری بات نے ایلی کی توجہ کو اس بات کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ جملہ ساختہ کو مسترد بھٹتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ اساتذہ کے چھرمٹ سے نکل جائے۔ ان کی زندگی کو کھوئی تھی۔ ان کی شخصیتیں بناؤں اور سمجھیں۔ انہوں نے اخلاقیات کا خوں پہن رکھا تھا۔ ان کا علم کتابی تھا۔ نذر فکر کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔

ایلی کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ وہ مغلہ تعلیم کو چھوڑ دے گا۔ جہاں اعلیٰ افسر علی احمد کے درست تھے۔ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے گا۔

رام گوپال

چند روز کے بعد ایلی لا ہور چلا گیا۔

لا ہور میں اس نے محمود سے بات کی۔ ”یار کوئی نوکری تلاش کرنے آیا ہوں۔ میری مدد کرو۔“ وہ بولا۔ ”میں سکول نوکری نہیں کروں گا۔“ ”نوکری تلاش کرنے آئے ہو۔“ ”محمود بولا۔“ تو مہربانی کر کے تلاش کرو۔ میں ابھی اس مجھے سے اکتا گیا ہوں۔“

محمود نے بات مذاق میں ٹال دی۔ اب ایلی کو سمجھے میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کس طرح کوشش کرے۔ اتفاق سے اس کی توجہ میز پر پڑے ایک اخبار کی طرف منعطف ہو گئی۔ اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ چونک پڑا۔ اخبار میں لکھا تھا

ایک نئے ملکے کے لیے چھڑ آسامیاں پر کرنے کے لیے گردبجھو بیوں کی ضرورت ہے۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے محمود سے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے نوکری ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔“

محمود نہ سا۔ ”خالی تو بیویوں ہوتی ہیں روزانہ لیکن ملتی نہیں۔“ ”میں عرضی دوں گا۔“ وہ بولا۔

”دینے کا کیا مطلب ہے۔“ محمود چلایا۔ ”انہوں نے تو لکھا ہے کہ عرضی لے کر خود آ جاؤ۔ وہاں سینکڑوں سفارشی ہوں گے۔ تھیں کون اپو چھتا ہے۔“ ایلی نے عرضی لکھی اور اسے لے کر خواں ملکے میں جا پہنچا۔

ملکہ ڈاکٹر ایک نوجوان ہندو تھا۔ اس نے ایلی کا بغیر جائزہ لیا۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو آپ الیاسِ آصفی ہیں؟“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”اورا آپ ملکہ تعلیم میں ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”کتنی نوکری کر چکے ہیں آپ ملکہ تعلیم میں۔“

”پندرہ سال۔“

”پندرہ سال کافی لمبا عرصہ ہے۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”لیکن آپ اس نوکری کو چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

ایک ساعت کے لیے ایلی نے سوچا اور پھر فیصلہ کر دیا کہ وہ اسے پنجی بات بتائے گا۔ بولا۔

”جناب ملکہ تعلیم میں میرے والد کا اثر ور سو خ ہے۔“

”سیتو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تو آپ وہ ملکہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

”میں ایسے ملکے میں تو کری نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں بلا اولاد پنے بل بوتے پر ترقی حاصل نہ کر سکوں۔“

”کیوں۔“ ڈائریکٹر نے پوچھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”کیا آپ کو معلوم ہے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ ”کہ یہ آسامی جس کے لیے آپ نے درخواست دی ہے مستقل نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”اس میں پیش نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”آپ کی پندرہ سال کی انکری بے کار جائے گی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولا۔

”میں آپ کو یہ آسامی کر آپ کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔“

”معاف کیجئے گا۔“ ایلی نے کہا۔

”میرا فائدہ اور نقصان میں بہتر سمجھتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ ”تو آپ امتحان میں شامل ہو جائیے۔“

”امتحان۔“ ایلی نے دو ہرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”هم انزو یو یلیں گے۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو میں آپ کا کیس رکنڈ کروں گا۔“
انزو یو کے بعد ڈائریکٹر نے ایلی کو بلا یا۔ اور ایک نامپ شدہ کاغذ اس کے ہاتھ
میں تھما دیا۔ ”یہ آفر ہے۔“ وہ بولے۔ ”اگر آپ کو ڈیڑھ سور و پے ماہوار تنخواہ منظور
ہے۔ تو آپ مجھ سے بات کر سکتے۔ لیکن قب جب آپ یہاں جائیں کرنے کے لیے
میں۔“

”آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں بے حد شکر لذار ہوں۔“ ایلی نے
جذبہ کی شدت سے اٹک اٹک کر کہا۔
”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔
”میں تو سمجھتا ہوں۔“ ایلی نے پچھ لینا چاہا۔
”آپ غلط سمجھتے ہیں۔“

”اتنے میں ایک چپر اسی کچھ کاغذات لے کر آ گیا۔“

”وراٹھر ہے۔“ ڈائریکٹر نے ایلی سے کہا۔

”تشریف رکھیے۔ ایک منٹ۔“

کاغذات پر دستخط کر کے وہ ایلی کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ان ”بچوں پر احسان کیا ہے جنہیں
آپ پڑھاتے ہیں۔“ ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بے حد ناموزوں ہیں۔“ وہ بولا۔ ایلی کی سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہے۔

”یہ درست ہے۔“ وہ بولا۔ ”کہ آپ ان میں فلکر کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ
بھی سچ ہے کہ آپ ان میں حقیقت کی پرست بیدار کرتے ہیں۔“

”جی میں۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”سن لیجئے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔

ایلی خاموش ہو گیا۔

”لیکن آپ کی تعلیم ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور تمام دنیا حرفی بن کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔“ وہ رک گیا۔

پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کی تعلیم کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مشکلات پیدا ہو گئیں بلکہ میری بیشتر مشکلات کی وجہ آپ ہیں آپ۔“

ایلی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا نام رام گوپا ہے۔ میں آپ کا شاندار دہول۔

ڈاکٹر نے تپاک سے ایلی سے با تھہ بڑھایا۔ ایلی کی زبان گلگ ہو چکی تھی۔

”یہ بھی صحیح ہے۔“ رام گوپا بولا۔ ”میں نے آپ سے پایا بھی بہت کچھ ہے۔“ بہت کچھ۔ خدا حافظ۔“

ایلی کے استغفاری پر ایک شور مج گیا۔ لالہ جی نے جوان کے ہیڈ ماٹر تھے اپنا سر پھیٹلیا۔ وہ ایلی کو بات بار سمجھاتے کہ پندرہ برس کی توکری کو یوں ٹھوکر مار کر چلے جانا عقل مندی نہیں۔ اساتذہ بھی حیران تھے۔ علی احمد نے سناؤ فوراً ایک خط لکھا۔ ”خود ارائی جماقت نہ کرنا ورنہ زندگی بھر پچھتاو گے۔“ تمہیں مسٹر معروف سافر اعلیٰ کہیں نہیں ملے گا۔ اس محلے کونہ چھوڑو۔ چونکہ محلہ تعلیم کا وزیر بھی میرا پرانا لگو ٹیا ہے۔ ایسی آسانیا کہیں دستیاب نہ ہوں گی۔“

لیکن ایلی نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

صرف رحل رنگی اور مانی تھے۔ جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔

رضی نے کہا۔ ”بھی دانہ پانی کی بات ہے۔“

رنگی بولا۔ ”یار میں بھی اس محلے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک بات نہیں بنی۔“

وہاں جاؤ گے تو میرے لئے بھی کوشش کرنا۔“

”بڑا اچھا کیا تم نے۔“ مانی بولا۔ ”شabaش اپنا راستہ خود بناؤ۔ چاہے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔“

لاہور میں ایلی کی زندگی یکسر بدل گئی مکملہ بدلنے کی وجہ سے ماض کی تمام تلخیاں گویا اس کے نامہ اعمال بے حل گئیں۔ مکملہ تعلیم میں اس سے افران اور رفتائے کارکسی نہ کسی حد تک اس کے گزشتہ کارناموں سے واقف تھے۔ اس کی ہر بات کا مفہوم اس کی گزشتہ زندگی کے تاثرا پر کے حوالے سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات بلا واسطہ کوئی دیتیت نہ رکھتے تھے۔

اس مکملے میں وہ ماصل کے حوالے سے قطعی الازم ہو گی۔ اس کے علاوہ یہاں اس کے ہمکار رسمی خیالات اور روکھاوے کے قدس سے بے نیاز تھے اگرچہ وہ مذر رہو کر سوچ نہ سکتے تھے لیکن مذر رخیالات کے خلاف ان میں مغض نہ تھا مکملہ تعلیم کو چھوڑ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ بھرے جو ہڑے سے نکل کر دریا میں آپنچا تھا۔ وہاں روانی تھی و سمعت تھی اور جمود نام کو نہ تھا۔

نئے مکملے میں آ کر چند ہی روزاں نے محسوس کیا جیسے وہ رانا ایلی نہ تھا۔ جیسے بینی ہوئی زندگی مغض ایک خواب ہو۔

”میں نے کہا نہ تھا۔“ شہزادہ کرمسکراتی۔ ”تمہاری زندگی پھر سے شروع ہو گی۔“ لاہور پہنچ کر اس نے پہلی مرتبہ شہزادہ کو یاد کیا۔ شہزادہ کی یاداب اس کے ذہن میں گزشتہ تلخیوں سے بے تعلق تھی۔ جب بھی شہزادہ کی یاد آتی تو وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا۔ اور اس کے دل میں عجیب سی خوشی پیدا ہوتی۔

لاہور میں اس کاموں زاد بھائی رفیق تھا۔ پھر فرحت بھی وہیں تھی۔ چونکہ اس کا خاوند اجميل لاہور کے ایک وفتر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور حکومت کی وساطت سے انہیں مادھو محلہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ایلی فرحت کے پاس

ٹھہر اتھا۔ اور ایک بار پھر اسے بھرے گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ فرحت نے ایک بڑا سا کمرہ ایلی عالی اور ہاجرہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

ہاجرہ سے جب فرحت نے سنا کہ رنگی اور مانی ایلی کی شادی کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ فرحت کو ایلی کی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ لیکن اس نے ایلی اور شہزاد کے تعلقات کے کبھی اچھی نیاز سے نہ دیکھا تھا۔

ابھی ایلی کو لاہور آئے چند ایک روز ہی ہوئے تھے کہ مانی اور رنگی لاہور آگئے۔ رنگی کے لئے لاہور ایک عظیم نعمت تھی۔ وہ وہاں آ کر بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خوبصورت ماحول اس کے نزدیک سب سے بڑی نعمت تھی۔ لاہور میں لباس تھا جوانی تھی۔ رنگ تھا۔ شوہی تھی۔ اور رنگی کے لئے یہی بہشت تھا۔

دوسرا روز وہ اکٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ راگ و دیا کی باتیں کرتے رہے۔ پتلی اور شریعتی کے قصے دہراتے رہے۔ جب رنگی اور مانی جانے لگے تو رفتار رنگی بولا "ایلی تمہارے لئے ایک ایسی بیوی تلاش کی ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ وہ تمام خصوصیات اس میں ہیں جن کی تمہیں اشد ضرورت ہے۔ شکل و صورت سے تو تم بے نیاز ہو۔ باقی رہی طبیعت تو جناب ایسی نیک لڑکی ہمارے قبے میں تو ہے نہیں کوئی۔ اور اس کا باپ ایک لا جواب مرد ہے۔ اس قدر رشدت کی انفادیت شاید ہی کسی میں ہو۔ جو منہ سے کہہ دیا پتھر کی لکیر سمجھو لو۔ اور دیانتداری کی توحد نہیں کوئی۔ بات کا پکا قول کا پورا اور رسماں سے بیگانہ بالکل بیگانہ۔ وہ لوگ آ کر تمہیں دیکھ لیں گے جیسے حام طریقہ ہے اور یہ بھی محض رسم ہے چونکہ لڑکی گھہت کی بچپن کی سیلی ہے وہ اسے ذائقہ طور ہے۔ بہر حال بات کی سمجھو۔

"دیکھو بھائی۔" ایلی نے کہا "چاہے جو بھی چاہے کرو میرے مرضی کے متعلق کوئی بات چھپا کر نہ کھانا ایمانہ ہو کہ بعد میں کہیں ہم سے دھوکا کیا گیا۔"

"یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔" مانی بولا۔

”خوبیں یا ریتی غلط ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تم ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو نہیں جانتے۔“ مانی نے کہا۔ ”بے حد غلیظ لوگ ہیں۔ پشت در پشت وو کامداری کرتے رہے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر روپیہ تک محدود ہے جس کے پاس روپیہ ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ ہر بات قابل قبول ہے جس میں سے رسم کی باؤ آتی ہو۔ نئی بات الحاد ہے۔ نیا چین قابل تلف ہے۔“ مانی شدت میں نہ جانے کیا کہتا گیا۔ رنگی مسکرا رہا تھا۔

ایلی سورج رپا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جس قبے نے رنگی گلہت اور مانی جیسے کروار پیدا کئے ہوان۔ وہ قبہ ازی طور پر ہنگ سے خالی ہو یا زندگی سے محروم ہو ضرور مانی بڑھا کر بات کر رپا تھا۔ یونکلہ مانی میں تو تو ازن مفقوود تھا۔ اس میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا خود پسندی کی دلی بھٹک لمحی اور بے پناہ جرات تھی۔

شادی کے متعلق ایلی اب سوچنے سمجھنے اور ہر کھنے کا قائل نہ رہا تھا۔ زندگی میں بہت سی باتیں جو اس نے سوچ سمجھ کر کی تھیں ان کا انجام اچھا نہ ہوا تھا۔ عورت کے متعلق تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ چاند کی طرح ایک مخصوص پہلو آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور عورت میں کئی ایک پہلو ہیں۔ متجمسم پہلو۔ متذبذب پہلو۔ ”مجھے کیا۔“ اور وہ پہلو جس کے تحت شہزاد نے اس شرایبی کے متعلق کہا تھا۔ ”تھیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میرے سامنے بالک بلک کر گھٹ کھٹ کر مرے۔“

عورت کو پر کھنا ایسی کے خیال کے مطابق ناممکن تھا۔ عورت میں یہ صلاحیت تھی کہ سال باسال اپنا ایک مخصوص پہلو پیش کرے وہ سالہا سال تبسم پہلو پیش کر سکتی تھی کیسے اسی حالات کیوں نہ ہوں کتنی یہ مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو تبسم ہی دکھائی دے گی۔ اور جب وہ سمجھے کہ اب ضرورت نہیں رہی تو حالات کے تقاضے سے بے نیاز ہو کر گھونا شروع کر دے گی۔ یا بے پرواٹی اور بے نیازی کا جامہ اوڑھ لے گی۔ اس لئے عورت کو خانچے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا

تھا ایلی سمجھنے لگا تھا شادی ایک جواہر ہے۔ چاہے آنکھیں پھبڑاڑ پھاڑ کر کھلیو یا آنکھیں بند کر کے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے یہ خواہش محسوس نہ کی تھی کہ ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ لے یا ہاجرہ کو بھیج کر اس کے ذریعے معلومات حاصل کرے۔

نامن پور

نامن پور ایک پرانا قصبہ تھا۔ جو لاہور سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا نامن پور مغلوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ قصبے پر مغلوں کی مہربشت تھی قصبے کے گرد چھوٹی ایسٹ کی بنی ہولی چاروں یواری تھی۔ جہاں میں آشودروازے کھلتے تھے۔ چاروں یوارے کے اندر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے تنگ گلی نمابازاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان تنگ گلیوں کے اروگرواؤ پنجی اوپنجی چونے کی عمارتیں تھیں جو یہاں تھیں۔ ادھر سے گئے زیوں کا احاطہ تھا اور سیدوں کا پر لی طرف دیوانوں کا۔

قصبے کے شمال مغرب میں ہندوؤں کا سینہ کنہ آباد تھا۔ جن کی وجہ سے نامن پور مشہور تھا سیٹھوں کا یہ کنہ نامن پور کا قدیم ترین کنہ تھا۔ نامن پور کے گرد و نواح کے کمیت انہیں کی ملکیت تھے۔ سیٹھ حسین تھے، متھل مزاج تھے اور دولت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ سیٹھوں کے بعد نامن پور کے نو مسلم مشہور تھے وہ سب ولیش تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ اور وہ قدیم زمانہ سے دو کامداری کرتے آئے تھے۔ ان دیشوں کی کئی ایک گوئیں نامن پور میں آباد تھیں مثلاً کاپڑ تھے ناروج تھے ہنگا تھے چالیہ تھے۔ نامن ہور اور اس کے جوار کے قصبوں اور شہروں میں ان کی دو کامیں تھیں۔ جہاں وہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے۔ ان میں چند ایک لوگ ہندوستان کے دور و دراز کے شہروں میں جا کر پنجاب کی منصوعات بیچتے تھے۔ چند ایک ماہ شہروں کے چکر لگاتے اور پھر نامن پور میں لووٹ آتے تاکہ اگلے چکر کے لیے اشیاء فراہم کریں۔